لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی

جہد للبقاء

یعنی

فیوضاتِ سورۂ فاتحہ

قرآنی دعائے نماز اور انسانی معاشرت

اقتصاد۔ اخلاق اور روحانیات پر اس کا گہرا اثر

مُصنّفہٗ

حضرت خواجہ کمال الدّین صاحب مُبلّغ اسلام

سنہ ۱۹۶۲۸ء

محمدی الیکٹرک پریس لاہور میں چھپی

باہتمام ملک دین محمد مالک دین محمدی الیکٹرک پریس لاہور بیرون اکبری دروازہ

بار اول قیمت ۱۴/-

انتساب

اِن اوراق کی اشاعت کو ہمشیرہ محترمہ جنابہ خدیجۃ الکبریٰ
(بیگم صاحبہ مکرّم محترم مصطفےٰ احمد صاحب رئیس گیا) کی فیاضی طبع سے
ایک خاص نسبت ہے۔ یعنی آپ نے ہی اس کتاب کی اشاعت کے اخراجات
اپنے ذمّے لیے ہیں۔ اس سے پہلے بھی میری ایک اور کتاب "ردِّ نسخ"
کی اشاعت آپ کے ہی ایثار کی مرہونِ احسان ہے۔ فی زمانناِ یہ خاتون
اسم بامسمّیٰ ہی ثابت ہوئیں۔ جس طرح حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا
کا زر و مال ابتدائے اسلام میں دینِ حقّہ کی اشاعت کے لیئے وقف
ہو گیا۔ اسی طرح اس زمانۂ غربت اسلام میں، آپ خدا کی دی
ہوئی نعمت میں سے کچھ نہ کچھ خدمت اسلام میں خرچ کرتی ہی رہتی
ہیں۔

مجھے امید ہے کہ میرا اس کتاب کو آپ کے اسم گرامی پر معنون کرنا
پسند خاطر ہی ہوگا۔

(خواجہ) کمال الدین

استعذار

جس حالت نقاہت میں میں نے یہ کتاب لکھی ہے ممکن نہ تھا کہ اس میں کوئی نہ کوئی نقص نہ رہ جاتا۔ میرے اعصاب میں ۱۹۲۱ء سے کچھ اس قسم کا انحطاط پیدا ہو چکا ہے کہ اگر ایک نصف گھنٹے کیلئے میں اپنی قلم سے کچھ لکھوں تو کل کا کل نظام عصبی مشتعل ہو کر مجھے سارے دن کیلئے بیکار کر دیتا ہے چنانچہ ۱۹۲۱ء سے آجتک جو کچھ میں نے لکھا وہ بطور املا دوسروں کے ہاتھ سے لکھوایا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایسی تصنیف کی زبان بعض خوبیوں سے معرا ہو جاتی ہے۔ اس کا علاج میں یہ کیا کرتا تھا کہ کتاب کے خاتمہ پر خود نظر ثانی کر کے اپنی تالیف تصنیف کو ایسی غلطیوں سے پاک کر لیتا تھا لیکن اس وقت طبی مشورہ یہ ہے کہ میں ہاتھ اور آنکھ دونوں کو استعمال نہ کروں اسلئے میں خیال کرتا ہوں کہ اس کتاب میں خوبصورتی زبان کا پورا لحاظ نہ رہا ہو۔ میں نے اظہار مطالب کو انشائی خوبیوں پر مجبوراً مقدم رکھا۔

اس تالیف میں بظاہر ایک اور نقص بھی ہے لیکن فی الواقع وہ کوئی نقص نہیں۔ بعض دقیق مسائل کی تشریح میں مجھے تکرار سے کام لینا پڑا۔ کیونکہ میرے مخاطب وہ صاحب بھی ہیں جو تکرار مطالب کے طریق پر ہی مصنف کے مافی الضمیر کو سمجھ سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک ہی مسئلہ کو کسی اور عنوان تلے ایک دوسرے رنگ میں بیان کرنیکی مجھے ضرورت پڑی ہے وہاں بھی میں نے برعایت اختصار پہلے کی لکھی ہوئی بات کو بغرض استحضار دوہرا دیا ہے۔ ذی علم احباب سے امید ہے کہ وہ ان فروگذاشتوں کو نظر عنایت سے دیکھیں گے۔ والسلام

خواجہ کمال الدین۔ پرتاب فارم۔ سرینگر کشمیر۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۲۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جہد للبقاء

فیوضاتِ سورۂ فاتحہ

قرآنی دعائے نماز اور انسانی معاشرت

اقتصاد۔ اخلاق اور روحانیات پر اُس کا گہرا اثر

تمہید

سببِ تصنیفِ کتاب پچھلے ماہ ایک دوست کی تحریک پر جو اَوراد و اشغال ماثورہ سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں مجھے سورۂ فاتحہ پر کچھ کہنے کا موقع ملا۔ اور مولوی عبدالرحیم صاحب بی۔ اے نے جو آجکل میرے سیکرٹری ہیں رسالہ اشاعت اسلام کے لیئے میرے الفاظ قلمبند کر لیئے۔ یہ باتیں رسالہ مذکور کے ستمبر نمبر میں چھپ جاتیں۔ لیکن اس موقع پر مجھے اپنے ایک مکرم لالہ جیون لال صاحب کورٹ انسپکٹر عدالتہائے کشمیر یاد آ گئے کچھ عرصہ ہوا آپ نے مجھے ایک خط و کتابت دکھلائی تھی جو

لالہ صاحب موصوف اور مکرمی حضرت مولوی محمد علی صاحب پریزیڈنٹ احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور میں سورۃ فاتحہ کے متعلق ہوئی تھی[1]۔ مجھے اِس تحریر کے دکھلانے سے لالہ صاحب کی غرض یہ تھی کہ موضوع خط و کتابت پر میں بھی اپنے خیالات ظاہر کروں۔ چنانچہ اس خط و کتابت کو اب میں نے پھر منگوایا۔ اسکے پڑھنے پر میرا تخیل مجھے کہاں کا کہاں لے گیا۔ اور میرے ذہن میں جو جو باتیں آئیں وہ مجھے ایسی نظر نہ آئیں کہ وہ میرے ہی سینے میں محفوظ رہیں ؎

گو میری موجودہ صحت تو اس امر کی متقاضی نہیں کہ میں کوئی دماغی محنت کرسکوں میں درا صل اس وقت ایک لمبے آرام کا محتاج ہوں۔ اور طبی مشورہ بھی یہی ہے۔ لیکن دل کے جوش نے مجھے مجبور کردیا کہ میں اپنی موجودہ کمزوری صحت پر اس فریضہ کو مقدم کروں۔ جس شافی مطلق نے سل اور ذیابیطس جیسے امراض خبیثہ سے نجات بخش کر مجھے از سر نو زندگی عطا فرمائی اسکا بہترین شکریہ میں نے یہی سمجھا کہ میں اس موضوع پر کچھ لکھا دوں ؎

امراض سے شفا پانے کے موقع پر ہر مذہب و ملت نے خیرات و صدقات کی سفارش کی ہے اور میرا اس پر ایمان و عمل بھی ہے۔ ہاں خدا کی راہ میں یا اُس کی عطیات کے شکریہ میں کچھ دیدینا اسلیئے **صدقہ** کہلاتا ہے کہ اِس کارِ خیر سے ایک انسان خدا تعالیٰ پر اپنے ایمان کی **صداقت** دکھلاتا ہے۔ لہٰذا جتنی بھی قیمتی سے قیمتی اور پیاری سے پیاری چیز اللہ کی راہ میں کوئی انسان

[1] یہ خط و کتابت ان اوراق کے خاتمہ پر دیدی جائے گی ۱۲ عبد الغنی

بطور صدقہ دے۔ اسی نسبت سے وہ اپنے صدق و ایمان کا ثبوت دیتا ہے بشرطیکہ یہ کام ریا کاری یا نفس کی ملونی سے پاک ہو۔ اس لیئے انسان صدقہ میں وہ چیز دے جس سے اسکی صداقت ایمان کا پتہ چلے۔ اس لیئے موجودہ موقع پر خیرات و صدقات کے اور کاموں کے علاوہ میں نے بہترین صدقہ اس کتاب کی تصنیف میں دیکھا۔ کیونکہ اس وقت کل ایسی اشیاء کے مقابل جو خیرات و صدقات میں خرچ ہو سکتی ہے۔ میری نگاہ میں میری صحت ایک محبوب ترین چیز ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

اگر صحت جیسی قیمتی چیز خدا کی راہ میں خرچ ہو جائے تو زہے قسمت جس قدر بھی فضل مجھ پر آج تک ہوا ہے اُسکے شکریہ میں اگر یہ کام مجھ سے ہو جائے تو میرا ایمان ہے، کہ شافیٔ برحق بالضرور میری صحت میں کامل اضافہ فرمائے گا۔

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ

(ترجمہ) اگر تم شکر گزار ہوگے تو ہم تمہیں اور زیادہ دیں گے" اس خوش خبری کے بعد جو انذاری الفاظ ہیں وہ نہایت ہی خطرناک ہیں۔ "وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ" (ترجمہ) یعنی اگر تم کفر نعمت کروگے تو میرا عذاب شدید ہوگا" اس آیت نے لفظ کفر کی بھی تشریح کردی۔ یہاں "کفر" اور "شکر" ایک دوسرے کے بالمقابل واقع ہوئے ہیں یعنی عدم شکر کا نام بھی کفر ہے۔

میرے حلقۂ احباب میں کثرت سے اصحاب دست دعا کے ساتھ اس گھڑی کے منتظر بیٹھے تھے کہ اللہ تعالیٰ مجھے پھر خدمت دین پر قائم کردے

لے لوگو! جب تک خدا کی راہ میں وہ چیزیں خرچ نہ کروگے جو تم کو عزیز ہیں نیکی کے درجے کو ہرگز نہ پہنچ سکوگے۔

بہر دست اُن کے لیئے یہ امر باعث مسرّت ہوگا کہ میں نے اِن اوراق کے ذریعہ اِس خدمت کی پہلی قسط ادا کردی۔ لیکن میں ان احباب سے متمنی ہوں کہ میری اس تھوڑی بہت صحت کے شکریہ میں جس نے مجھے یہ چند سطور لکھانے کے قابل کیا ہے وہ بھی میرے ساتھ اس صدقہ حقّہ میں شریک ہوں اور اُن کی طرف سے صدقہ یہ ہوگا کہ وہ اس کتاب کی مفت اشاعت میں امداد فرمائیں اس کتاب کی ایک ہزار کاپی کی مفت اشاعت تو اُس ہمشیر محترمہ کی طرف سے ہوگی جن کے نام نامی پر یہ کتاب معنون کی گئی ہے اور اس ہزار کاپی کا زیادہ حصہ غیر مسلم احباب کی خدمت میں بھیجا جائے گا۔ لیکن میرے نزدیک تو اس کتاب کی اشاعت مسلم غیر مسلم ہر طبقہ میں ہزاروں تک ہونی چاہیئے۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر ان اوراق کے پڑھنے کے بعد میرے احباب مذکورہ بالا کی بھی رائے ہو تو یا تو وہ خود اس کی متعدد کاپیاں منگوا کر اپنے ہاں تقسیم فرمائیں یا کچھ رقم خواجہ عبدالغنی صاحب سکرٹری مسلم مشن ووکنگ عزیز منزل لاہور کو اس غرض کے لیئے بھیجدیں جس کی رسید رسالہ اشاعت اسلام میں چھپ جائے گی۔"

گو یہ کتاب ایک موضوع مشخصہ کی حامل ہے لیکن ایک منصف مزاج پر اِن اوراق کے ذریعہ یہ امر بھی متحقق ہو جائے گا کہ سورۃ فاتحہ اور قرآن کریم فی الواقع منجانب اللہ ہیں۔ اِس وقت ایک طرف مغرب کی مادیت پرستی نے اخلاقِ فاضلہ و روحانیت کو ترک کر کے نسل انسانی پر خطرناک ہلاکت وارد کر رکھی ہے اور اس کا دائرہ اثر دن بدن وسیع ہو رہا ہے جتنی کہ

موجودہ تصادم قومی جو خرمنِ انسانیت کو تباہ کر رہا ہے وہ در اصل مادیت پرستی کے آثار و اظلال میں سے ہے۔ اور دوسری طرف جو مشرق کے اقتصادی جمود نے اہل مشرق کو بازیچہ مغرب بنا رکھا ہے۔ اِن سب کا اگر کوئی علاج صحیح ہے تو وہ اس الہام الٰہی میں ہے۔

ہم مسلمان نماز و دعا میں کیوں سورۂ فاتحہ الہامی الفاظ میں پڑھتے ہیں؟

لالہ جیون لال صاحب نہ تو سورہ فاتحہ کے نفس مضمون پر اعتراض کرتے ہیں نہ اسکی خوبی پر کوئی حرف رکھتے ہیں بلکہ وہ تو اسکی رفعت شان کے کچھ ایسے گرویدہ معلوم ہوتے ہیں کہ وہ ویدوں میں سے سورہ فاتحہ کے مطالب کا ایک منتر بھی نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس منتر کا ترجمہ وہ ہو بہو وہی کرتے ہیں جو مترجمین قرآن نے اُردو زبان میں سورہ فاتحہ کا کیا ہے اگرچہ آپ کے اس ترجمہ وید منتر پر ہمارے پنڈت نامدار مولوی عبد الحق صاحب ودیارتھی کو اعتراض ہے۔ جن کے نزدیک یہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا مولوی عبد الحق صاحب کی سنسکرت دانی پر تو اس وقت کوئی حرف نہیں لا سکتا چنانچہ ویدارتھ کرنے میں آریہ صاحبان اور سناتنی صاحبان دونوں کے بعض مباحث میں خود فریقین نے انہیں کئی دفعہ حکم تسلیم کیا ہوا ہے اسلیے ودیارتھی صاحب کی باتیں بھی قابل لحاظ ہیں۔ لیکن مجھے اس بحث میں

پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں مختلف مذاہب کی دعاہائے ماثورہ میں کوئی
مقابلہ کرنا نہیں چاہتا۔ اِن معاملات میں انفرادی تقابل کبھی کسی مفید نتیجہ
کو پیدا نہیں کرتا۔ اور میں نے علی العموم اِس سے احتراز کیا ہے۔ مجھے تو
لالہ جی کے اعتراض کے جواب میں کچھ عرض کرنا ہے۔ لالہ صاحب فرماتے
ہیں کہ جب لکھو کہا مسلمان سورۂ فاتحہ کے معنی و مطالب سے واقف ہی نہیں
تو وہ اسے عربی زبان میں دُہرا کر اُس سے کس طرح مستفید ہو سکتے ہیں عقیدت
تو ایک دوسری چیز ہے۔ لیکن نماز میں ایک اہل نماز کا دل و دماغ ان الفاظ
کے ہمراہ نہیں ہو سکتا جو اسکی زبان سے تو نکلتے ہیں لیکن وہ انکے معنی سے
ناواقف ہوتا ہے"۔ لالہ صاحب کا یہ اعتراض کچھ ہم پر ہی نہیں بلکہ انہیں
اپنے اہل مذہب سے بھی یہی شکایت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سندھیا گایتری
یا کسی اور وید منتر کو بطور دعا۔ سنسکرت زبان میں پڑھنے کی بجائے اگر اسکے
ترجمے اپنی اپنی زبان میں پڑھے جائیں تو وہ زبان مفید نتائج پیدا کریگی
حضرت مولوی محمد علی صاحب بجواب فرماتے ہیں کہ۔ اگر کسی مذہب کے
متبعین میں ہم آہنگی ضروری ہے اور وہ مذہب کسی ملک یا صوبہ تک
محدود نہیں بلکہ وہ ایک عالمگیر مذہب ہے تو اس ہم آہنگی کا قیام بھی اسی امر
کو چاہتا ہے کہ اسکے پیرو سب کے سب ایک ہی زبان میں نماز ادا کریں۔
اسلام چین سے لیکر امریکہ تک اور شمال سے چلکر جنوب تک مختلف دیار
و امصار کا مذہب ہے۔ ایک ملک کے مسلمان دوسرے ملک میں آتے جاتے
ہیں۔ اور امور چھوڑ اگر نماز بھی زبان کے ذریعہ ان میں ایک قسم کی وحدت

نہ پیدا کر سکے تو وحدت اسلامیہ ایک بے معنی چیز رہ جاتی ہے۔ رومن کیتھولک عیسائی بھی اس وحدت کے لیئے ہر جگہ اپنی عبادت لاطینی زبان میں کرتے ہیں اگرچہ جناب مسیح کی وہ زبان نہ تھی +

اس ضمن میں یہ امر بھی کچھ کم قابل لحاظ نہیں کہ سورۂ فاتحہ جس زبان میں الہام ہوئی وہ زبان اس وقت بھی زندہ زبان ہے اور وہ زبان مختلف اقوام و ممالک اسلامیہ کی مادری زبان ہے۔ لہذا نصف سے زیادہ مسلمان تو نماز کو اپنی مادری زبان میں ہی ادا کرتے ہیں۔ ہاں لالہ صاحب کا اعتراض ایسی الہامی دعاؤں کے متعلق ایک حقیقی اعتراض ہو جاتا ہے جن کی زبانیں اس وقت مردہ ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں نفس انسان پر اس کا ماحول، اسکے اضافی تعلقات، اسکے وقتی اشغال جو تاثرات ڈال دیتے ہیں۔ اگر انہیں بھی سامنے رکھا جائے تو نماز یا دعا خواہ کیسی ہی نامانوس یا غیر زبان میں ہو۔ اور الفاظ دعا سے دعا کنندہ بھی خواہ ناواقف ہو لیکن اس کا یہ خیال کہ میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں۔ ایک طرح کا خوف آلہی پیدا کر کے اسکے بعض اعمال پر قوی اثر ڈال ہی دیتا ہے۔ اور یہ اثر اور بھی زبردست رنگ اختیار کر لیتا ہے جب ایک مسلم کسی غیر ملک کے مسلمانوں کی ایک جماعت میں کھڑا ہو کر ایک ہی خدا کے سامنے ایک ہی طرف منہ کر کے ایک ہی زبان میں اپنی نماز ادا کرتا ہے۔ بہرحال لالہ صاحب کی باتیں کسی ناپسندیدہ نکتہ چینی کی حامل نہیں۔ ان کا انداز بیان ان کی صداقت پر دلالت کرتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ جو کہتے ہیں۔ ایک حد تک صحیح کہتے ہیں۔ یہ امر بدیہی ہے کہ طلب مدعا۔ یا رفع ضرورت یا عفو معصیت

کے لیے مادری زبان کے دعائیہ فقرات جس جوش، جس خشیت یا جس انابت کو پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ باتیں غیر زبان میں ناممکن ہیں۔ مادری زبان ہی جس طرح ہمیں چشم پُرنم کرکے درِ اجابت تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ علی العموم دوسری زبان میں محال ہے۔ یہ ایک صداقت ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر نماز کا مقصد یہی چند باتیں ہوتیں تو الہامی نماز میں دُعا مانگنا چھوڑ اِن اغراض کے لیے کسی الہام کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ان ضروریات نے تو خدا چھوڑ پتھروں کے آگے اشرف المخلوقات کو جھکا کر اُس کے منہ سے دُعائیہ رنگ میں سخت سے سخت دل کو ہلا دینے والے اور سنجیدہ سے سنجیدہ رُوح کو کپکپا دینے والے فقرات نکلوائے ہیں اور بعض وقت وہ ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ایک موحد صُوفی اپنے وقت خاص میں بہ تبدیلی مناسبہ انہیں الفاظ کو اپنے معبُودِ حقیقی کے سامنے دہرا دے تو وہ ایک رُوح کی سچی آواز ہوگی علاوہ ازیں کوئی الہامی دُعا خواہ کیسی جامع الفاظ میں ہو مسبب بلحاظ کسی ذاتی یا انفرادی ضرورت کا اظہار نہیں کر سکتی۔ کامل شوق کے حامل اور حقیقی درد کے مظہر اپنی زبان کے ہی الفاظ ہوتے ہیں۔ کُل انبیاء علیہم السلام کی تو ایک زبان نہ تھی۔ آڑے وقت میں اُن کے مُنہ سے بھی دعائیہ فقرے اگر اپنی مادری زبان میں ہی نکلے تو کسی نازک وقت پر دوسرے کیوں اپنی مادری زبان میں دعا نہ مانگیں۔ آخر جناب مسیح کے مُنہ سے بھی صلیب پر جو دعا (ایلی ایلی لما سبقتنی) نکلی۔ وہ ان کی مادری زبان میں ہی تھی۔ اگرچہ اُنکی روزمرہ کی زبان عبرانی نہیں بلکہ ارمیک زبان میں تھی +

لیکن اسلام نے تو اگر جہاں خود مذہب کا نظریہ ہی بدل ڈالا جیسے کہ میں آگے چلکر دکھلاؤں گا۔ وہاں نماز کا نظریہ بھی بدل ڈالا۔ اس نے اسلامی نماز کو مذہب کا انڈکس اور حقیقی اسلامی یا مذہبی زندگی کی یاد دہانی کا ایک کامل ذریعہ ٹھیرایا۔ اسی لیئے قرآن کریم نے نماز کا نام **ذکر** رکھا اور عربی زبان میں ذکر کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ بالمقابل اسمیں بھی شک نہیں کہ کوئی انسان بھی ضروریات بالا (یعنی طلب مدعا حاضرہ، دفع ضرورت لاحقہ، عفو معصیت وغیرہ) سے باہر نہیں ہو سکتا۔ جن کا بہترین اظہار جیسے کہ اوپر عرض ہوا اپنی مادری زبان میں ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ ضروریات ہی علی العموم دُعا کے لیئے باعثِ تشویق ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ ضروریات اور ان کا دفعیہ بنفسہٖ ایک کامل زندگی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ باتیں کسی مذہب کی کُل کی کُل تعلیم پر حاوی ہو سکتی ہیں۔ ان دو امور کو سامنے رکھکر اس گتھی کو اگر سلجھایا تو اسلام نے ہی سلجھایا۔ ایک طرف تو ہمیں حکم دیا کہ ہم اپنی پنجوقتہ نماز میں سورۂ فاتحہ کو پڑھکر حقیقی اسلامی زندگی اور اسلام کے خلاصۂ تعلیم اور اسکی روح کو اپنے سامنے لے آئیں۔ یعنی اگر قرآنی تعلیم پر چلنے سے ہم حقیقی فلاح کو پا سکتے ہیں تو ہماری نماز قرآن کے تجویز کردہ دستور زندگی کو آٹھوں پہر ہمیں یاد دلاتی رہے۔ دوسری طرف شارع اسلام[1] علیہ الصلوٰة

[1] حضور علیہ الصلوٰة والسلام نے دنیا سے جدا ہونے پر جو خطبات عالیہ فرمائے ہیں ان میں سے آخری خطبہ میں ہم ذیل کے الفاظ پاتے ہیں "سنو مجھے رکوع و سجود میں قرآن پڑھنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ رکوع میں تو خدا کی عظمت کرو اور سجدہ میں خوب گڑگڑا کر دعا مانگو کیونکہ اس حال میں دعا قبول ہونے کی زیادہ امید ہے۔"

والسلام نے ہمیں تلقین فرمائی کہ ہم اپنے سجداتِ نماز میں خدا کے حضور اپنی ضروریات لاحقہ کو پیش کریں۔ چنانچہ صلحائے اُمت نے تسبیحات ماثورہ کے بعد سجدات میں جو درد بھری دعائیں کی ہیں وہ اپنی اپنی زبان میں ہی کی ہیں۔

اسلام کے اس نظریہ نماز کی صحت پر کسے کلام ہو سکتا ہے۔ اگر کسی کی نماز یا پرارتھنا اُسے صفائی قلب یا تکمیل نفس کی طرف متوجہ نہیں کر سکتی یا اُسکے معتقدات مخصوصہ کو اُسے یاد دلا کر اُسکے سامنے وہ دستورِ زندگی نہیں پیش کر سکتی کہ جس پر چلکر اُسکی زندگی اُسکے لیے اور دوسروں کے لیے نفع بخش ہو جائے تو پھر کسی ضرورت لاحقہ پر کسی معبود کی طرف رجوع کرنا تو ایک امر طبعی ہے مذہب کو اسکے تلقین کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ چنانچہ وحشی سے وحشی اور جاہل سے جاہل جنگل کے رہنے والوں نے بھی ایسی ضرورت کے پیش آنے پر جس کا علاج ان کی طاقت سے باہر تھا۔ الہامی تعلیم کے بغیر بھی مشہود یا غیر مشہود قوائے فطریہ کے آگے سر جھکا کر قربانیاں دیں اور دعائیں کیں۔ اُسی نے حجر، شجر، نجم اور اور عناصر پرستیاں پیدا کیں اسی نے اُن کی نگاہ میں معبودانِ باطل کو مجیب الدعوات بنا یا۔

جس غرض کے لیے میرے دوست لالہ جیون لال صاحب الہامی الفاظ فاتحہ کی بجائے نماز میں اسکا ترجمہ پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں یعنی اسکا وہ ترجمہ جو نماز پڑھنے والے کی مادری زبان میں ہو۔ وہ غرض تو ہم حسب ضرورت سجود میں پوری کر لیتے ہیں۔ لیکن اسلام نے جس مقصد اعلیٰ کو نماز سے وابستہ کیا ہے اور وہی کسی مذہب کی نماز کا بہترین نصب العین ہو سکتا ہے

وہ کسی زبان کے ترجمہ فاتحہ سے حاصل نہ ہوگا۔ دوسرے مذاہب کے تجویز کردہ الفاظ۔ عبادت ان اغراض عالیہ کو پورا کر سکتے ہوں یا نہ ہوں ان پر تبصرہ یا بحث کرنا میرے موجودہ مقصد سے باہر ہے۔ خود رائے صاحب اور ایسا ہی دیگر مذاہب والے اپنے الفاظ دعائیہ کو اس کسوٹی پر پرکھ لیں۔ لیکن میں انہیں یقین دلاتا ہوں۔ اور اس کتاب کے اوراق اس امر کی شہادت دیں گے کہ سورۃ فاتحہ نے ان مطالبات کو ابلغ طریق پر پورا کر دیا ہے۔ مثلاً لالہ صاحب موصوف کے علم میں ہوگا کہ گو ہر مذہب و ملت میں تعلیمات مذہبیہ کا محور و مرکز ایک ہی ذات پاک ہے جس پر ہم سب کا ایمان۔ لیکن معتقدات مختلف مذاہب نے اختلافِ عظیم ان میں پیدا کر کے اُن میں جداگانہ اعمال و رسوم پیدا کر دیئے ہیں۔ کیونکہ معتقدات ہی اعمال کا حقیقی سرچشمہ ہوتے ہیں ان سب کا باعث وہ اختلاف ہی ہے جو صفات باریہ کے متعلق ہم ایک دوسرے سے رکھتے ہیں۔ ہندو صاحبان اگر قدامتِ مادہ یا آواگون کے قائل ہیں تو اہل کلیسیہ کفارے اور الوہیت مسیح کو مانتے ہیں۔ بعض سرے سے خدا کی ہستی کے ہی قائل نہیں۔ اور جو قائل ہیں۔ ان میں سے بعض کسی الہام کے وجود یا اُس کی ضرورت کو ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح سے اور بہت سے اختلافات ہیں۔ ہم مسلمانوں کا عقیدہ ان سب باتوں کے خلاف ہی یہ اختلافات ملیہ کوئی معمولی اختلاف نہیں بلکہ بنیادی اور اساسی اختلاف ہیں۔ اور ان سب کا تعلق صفات باری سے ہی ہے۔ سورۃ فاتحہ میں جن صفات باریہ کا ذکر ہے وہ کچھ ایسے وسیع المفہوم و معانی والے الفاظ میں ظاہر کئے گئے ہیں

کہ اُن پر ایمان رکھنے والا نہ صرف عقائد بالا سے ہی انکار کر دیتا ہے بلکہ ان مقدس الفاظ کے مفہوم میں وہ دلائل قویہ کو بھی پا لیتا ہے۔ جن سے اِن باتوں کی تردید بھی ہو جاتی ہے۔ اب ان الفاظ کا کسی زبان میں ترجمہ کر دیا جائے اسمیں عقائد بالا کی طرف اشارہ تک نظر نہیں آتا۔ دور کیوں جائیں قرآن کریم کے تراجم کو ہی دیکھ لیا جائے جو اردو فارسی ہندی انگریزی فرانسیسی جرمنی وغیرہ میں ہوئے۔ ان میں سے کسی زبان کا ترجمہ سورۂ فاتحہ، اُسکے پڑھنے والے کی طبیعت کو عقائد بالا کی طرف ہرگز متوجہ نہیں کرتا۔

لیکن یہ تو ایک علمی بحث اور منطقیانہ قضایا ہیں ان کی طرف عامۂ طبائع کا آج رجحان نہیں رہا۔ یہ وہ دماغی ضیافت ہی جو مادیت زدہ دسترخوان پر نظر نہیں آتی۔ آج مسئلہ جہد للبقاء نے سب نظریے بدل دیئے ہیں اگر اِس مسئلہ نے میٹریل ازم کی روشنی میں وطنیت اور قومیت کا وہ تنگ دل مفہوم مغرب میں پیدا کر رکھا ہے کہ جس نے یورپ جیسے مختصر قطعہ کو پچیس۲۵ تیس۳۰ قوموں میں تقسیم کر کے نہ صرف اسے ایک مدت سے عرصۂ تیغ و تفنگ بنا رکھا ہے بلکہ یہ لوگ دوسری اقوام عالم کے متعلق یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ انہیں کی خدمت کے لیے پیدا ہوئی ہیں تو دوسری طرف مشرق میں روحانیت کے غلط مفہوم نے جہد للحیات کے متعلق کچھ ایسے خیالات پیدا کر رکھے ہیں کہ جنہوں نے یہاں کی اقتصادی حالت تباہ کر کے اہل مشرق کو مغرب کی کٹھ پتلی بنا دیا ہے۔ مغرب کے

اقتدار کو دیکھکر بعض مشرقی قومیں بھی اُن کے اتباع میں نہ صرف اخلاقِ صحیحہ کو گنوا رہی ہیں بلکہ اپنے مذہب کو خیرباد کہے جاتی ہیں۔ ہمارے اپنے ہی ملک میں ہندو بھائیوں کو دیکھ لیا جائے۔ آج "جہد للبقاء" میں وہ علی الاعلان اپنی قدیمی مذہبی روایات کو جواب دے رہے ہیں بلکہ اُنکے نزدیک تو شاستری تعلیم اُن کی قومیت، وطنیت کی حارج ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جس رفتار سے وطنیت کا یہ نیا مفہوم ہندوستان میں ترقی کر رہا ہے۔ وہ بہت جلد مذہب کو اس ملک سے نکال دے گا۔ یہی میری رائے خود اپنے ہم مذہب بھائیوں کے متعلق ہے۔ اور بات بھی صحیح ہے۔ آج ہم سب کے سامنے موت و حیات کا سوال آکھڑا ہے۔ اجانب کو چھوڑ خود یہاں کی قومیں ایک دوسرے کے درپے آزار ہیں۔ یہ ہندو مسلم جھگڑے سب کے سب جہد حیات کے کرشمے ہیں۔ وطنیت پرستی ہمیں اس انوکھے غیر مسلمانانہ فقرے کو سُنا رہی ہے:۔

"میں پہلے ہندوستانی ہوں اور پھر مسلمان"

وہ نہیں جانتے کہ حقیقی مومن و مسلم سے بڑھکر زیادہ محبِّ وطن و قوم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ اس غلط نظریہ میں پڑکر خدا کو رَبُّ العٰلَمِین پکارنے سے غافل ہیں۔ اُن کے نزدیک پرستشِ ربّ العالمین اور پرستش وطنیت دو متضاد چیزیں ہیں۔ یوں تو یہ بات سطحی نگاہ میں ایک حقیقت واضح نظر آتی ہے۔ ربّ العالمین کے پرستار کی وسعتِ نظر اسے قومیت

پرستی کے حدود سے باہر ہے جاتی ہے۔ اور یہ امر مفادِ وطن کے لیے غیر مفید سمجھا گیا۔ لیکن بالمقابل اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ قومیت پرستی ہی اس کے پرستاروں کو دوسرے بنی نوع کے حقوق کے اتلاف پر مائل کر دیتی ہے۔ دونوں عقیدے ایک نہ ایک زاویہ نگاہ سے مفید اور غیر مفید نظر آتے ہیں۔ لیکن ہمارے مسلم وطن پرست نہیں دیکھتے کہ وہ رب العالمین کے علاوہ کسی مالک یوم الدین کے بھی پرستار ہیں۔ یعنی ربوبیّت و مالکیت کا مشترک عقیدہ ضرر ہائے مذکور کو دور کر کے اسے نسل انسانی کے لیے انفرادی اور قومی طور پر بھی اور عامۂ نکتۂ انسانیت کی نگاہ سے بھی ازبس مفید بنا دیتا ہے۔ اس امر پر میں کچھ آئندہ مفصل عرض کرونگا۔

یہ یہاں کے فرقہ دارانہ یا مخلوط انتخاب کے ناخوشگوار تنازعے دراصل اسی نیشنل ازم کے تلخ ثمرات ہیں۔ پنجاب یا بنگال میں مسلمان دس نہیں پچیس سال کے لیے نشستوں سے خاص حقوق حاصل کریں۔ ان کی اقتصادی کمزوری انہیں کہیں کا نہ رکھے گی یا تو ہم بھی ہندو بھائیوں کی طرح اب مذہب سے الگ ہونا شروع کر دیں یا اسلام میں کوئی ایسی تعلیم ہو جو اس مصیبت کا علاج ہو سکے۔ قیام حیات، انفرادی یا قومی کے مطالبات پر آنکھ بند نہیں کی جا سکتی۔ جتنی بھی جلدی ہو مذہبی روشنی میں اس مسئلے کا حل ہونا چاہیئے۔ ورنہ جس طرح یورپ نے مذہب کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور ان کی پیروی میں کہا جاتا ہے کہ بعض مسلم قومیں بھی مذہبی شعار و تعلیم سے روگردان ہو رہی ہیں۔ اسی طرح ایک دن یہاں بھی مذہب کا حشر ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ مذہبی زندگی ہی اخلاق فاضلہ کی ذمہ دار ہے۔ اور
اخلاق ہی سے حقیقی انسانیت اور ہمدردیٔ بنی نوع پیدا ہوتی ہے۔ نفس
پرستی نے جو مادیت کے لازمی آثار و اظلال ہیں مغرب میں اسکا خون کر رکھا
ہے۔ اور یہی حال ایک دن یہاں ہوگا۔ ہندو بھائی سنگٹھن اور شدّھی کے
ذریعہ لاکھ اتحاد قومی کی کوشش کریں وہ فساد جو آج ہندو مسلم میں ہے وہی
کل اونچی نیچی ہندو قوموں میں پیدا ہونے والا ہے۔ اور اس کا آغاز ہو چکا
ہے۔ پنڈت نہرو جی رپورٹ میں دفعہ ایک سچا اور دل خوش کن فقرہ
دہرائیں۔ "زندہ رہو۔ اور دوسروں کو زندہ رہنے دو"۔ لیکن اس
جذبے کے پیدا کرنے کا علاج حقیقی تو ان کے مرتبہ دستور میں نظر نہیں آتا
اس کا حقیقی علاج اخلاق فاضلہ سے وابستہ ہے۔ اب اگر کوئی مذہب جہد
للبقاء کے مسئلہ کا صحیح حل تجویز کرکے ان مطلوبہ اخلاق کو پیدا کر سکتا ہے۔ اور
اُس مذہب کی تعلیم کی کامل نمائندگی نماز یا پرارتھنا میں ہو سکتی ہے تو مذہب
دنیا میں قائم رہ سکتا ہے۔ اور نمازیں بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔ والا ہمارا قدم تو مغرب
کے اتباع میں اُٹھ چکا ہے۔ یورپ کے گرجے عابدین سے خالی ہو چکے۔ مسجدیں اور
مندر بھی بے رونق ہوتے جاتے ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں۔ اس بات کی جو
ذمہ دار ہے اُسے سعدی علیہ الرحمۃ نے دو مصرعوں میں صاف صاف بتلا
دیا ہے ؎

شب چو عقدِ نماز بر بندم
چہ خورد بامداد فرزندم

پھر مذہب کو زمانے نے علی العموم روحانیات سے وابستہ کر رکھا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن اِس امر کے مفہوم اور اسکے حصول کی راہوں میں اِس وقت اختلاف عظیم ہے۔ چلہ کشی، جنگل نشینی یا مختلف ریاضتیں آج مرغوب خاطر نہیں رہیں۔ آج تو ایسے طریقوں کی ضرورت ہے کہ ہم اس دنیا میں رہکر باخدا بن سکیں۔ ورنہ روحانیت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اِن امور پر انشاء اللہ میں اسی کتاب میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھوں گا۔

اسلام نے اخلاق فاضلہ کی تکمیل کا ہی نام روحانیت رکھا ہے جنھیں اسی دنیا میں رہ کر ہم نے برتنا ہے۔ اسی کے حصول پر انسان روحانی زندگی میں قدم رکھکر ربانی رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے اور اسپر بلوغت انسانی ختم ہو جاتی ہے [illegible] کی طرف [illegible] ہماری نماز یعنی سورہ فاتحہ ہمیں پانچوں وقت متوجہ کرتی ہے۔ اِسی لیے خیمتیت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نماز کا نام مومن کا معراج رکھا ہے۔ اب مسلم نماز کی روح رواں سورہ فاتحہ ہے۔ یہی عین نماز ہے۔ اِسی کے مطالب پر غور کرنے اور اُنپر عمل کرنے سے انسانی استعدادیں صحیح معنوں میں اپنے کمال تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور یہی ایک انسان کا معراج ہے۔ یہ سب کی سب باتیں سورہ فاتحہ کے اصلی الفاظ میں تو مجھے نظر آتی ہیں لیکن اپنی مادری زبان چھوڑ مجھے تو روئے زمین کی ایک زبان بھی نظر نہیں آتی کہ جس میں سورۃ فاتحہ کا ترجمہ ان اغراض عالیہ اور اُن کے طریق حصول کو میرے سامنے لے آئے اِن حالات میں میں اپنی نماز میں اور اسکے علاوہ بھی اپنی دوسری دعاؤں میں

سورۂ فاتحہ کو الہامی الفاظ میں پڑھنے پر مجبور ہوں۔ اسی لیئے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے تاکید فرمائی کہ جو دعا بھی ہم کریں اسے سورۂ فاتحہ سے ہی شروع کریں۔

یہ سب کی سب باتیں اگر صحیح بھی ہوں اور میرا ایمان ہے کہ یہ صحیح ہیں تو بھی یہ امور نظری رنگ میں ہیں جو محتاج عمل ہیں۔ عمل ہی ایک چیز ہے جس کے بغیر کُل کی کُل انسانی قوتیں حالتِ جمود میں آجاتی ہیں۔ مگر عمل محتاج علم ہے۔ علم ہی ہر انسانی سکون و حرکت کا محرک ہوتا ہے انسان تہذیب و تمدن کی کسی حالت میں ہو۔ وہ کسی امر میں قدم نہیں اُٹھا سکتا جب تک اس امر کے متعلق اُسے تھوڑا بہت علم نہ ہو۔ اگر دنیا کا سُدھار صحتِ عمل سے وابستہ ہے تو صحتِ عمل صحتِ علم پر منحصر ہے۔ اسی لیئے ہر امر میں صحیح علم کا حاصل کرنا انسانی زندگی کی ضرورت اولین ہے۔ یوں تو علم کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور آئے دن نئے سے نئے علوم پیدا ہو کر انسانی عمل کو معراج ترقی کی طرف لیجا رہے ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ ایک انسان ہر علم سے واقف ہو۔ علاوہ ازیں ایک کا علم ہزاروں لاکھوں کے لیئے نفع رساں ہو جاتا ہے جو انہیں اسکے حصول کا محتاج نہیں رکھتا لیکن انسانی بہتری کے لیئے ایک علم مخصوص بھی ہے جسکا جاننا ہر فرد نوع کے لیئے ضروری ہے اور جسکے نہ جاننے سے انسان حدود حیوانیت سے باہر نکل ہی نہیں سکتا۔ میری مراد اس سے علم جذبات انسانیہ ہے۔ گو وہ علم اپنی ابتدائی حالت میں کیوں نہ ہو۔

انسانی فطرت آخر چند جذبات کے مجموعہ کا ہی نام ہی۔ ہمارے ہر قول و فعل کا باعث اِن ہی جذبات کے مطالبات ہوتے ہیں۔ اب اِن تمام جذبات انسانیہ کی جڑ اور بنیاد صرف دو جذبے ہیں جنہیں عربی زبان میں **غضب** اور **شہوت** اور ہندی میں کرودھ اور لوبھ کہتے ہیں۔ یہی دو جذبے انسانی کوشش کو مختلف ثمرات کے حصول میں لگاکر پھر ان ثمرات کی حفاظت بھی کرتے ہیں لیکن یہی دو جذبے بداستعمالی میں آکر نسل انسان کی ہلاکت و تباہی کا موجب بھی ہوجاتے ہیں۔ اِن دو جذبات کو جس طرح ایک عالم متبحر محسوس کرتا ہی اسیطرح ایک جاہل سے جاہل بھی انکے ہاتھ بکا ہوا ہوتا ہی۔ دوسرے علوم سے کوئی واقف ہو یا نہ ہو لیکن نسل انسانی کی صلاحیت اسی میں ہی کہ ہر ایک انسان اِن دو جذبات کے استعمال کا تھوڑا بہت صحیح علم رکھتا ہو۔

مذہب کا فرض ہی کہ ہمیں یہ مطلوبہ علم سکھلائے جس سے اعمال صحیحہ پیدا ہوں اور اقتصادی، اخلاقی اور روحانی منازل میں صحت و سلامتی کیساتھ گذر کر خدا تعالی کے دوارے تک پہنچ جائیں۔ یہ سب باتیں ایک ترتیب بلیغ کے ساتھ اسلام تعلیم کرتا ہی اور سورہ فاتحہ نے انہیں اجمالی صورت میں اپنے اندر جمع کرلیا۔ اِن حالات میں ہم سورہ فاتحہ کو اسکی اصلی زبان میں نہ پڑھیں تو کیا کریں۔

وجوہ بالا کو اگر کوئی صحیح بھی مان لے تو بھی اسپر دو اعتراض وارد ہوتے ہیں اول کیا یہ ممکن ہی کہ سورہ فاتحہ کا پڑھنے والا ان سارے امور کو نماز پڑھتے ہوئے اپنے ذہن میں رکھ سکے؟ میں کہتا ہوں کہ اسکی ضرورت نہیں۔ انسان مختلف اشکال واقع ہوئے ہیں ایک کا ذوق دوسرے سے جدا ہوتا ہی۔ مدارج میں

اختلاف ہے۔ علمی معلومات بھی ایک کے دوسرے سے نہیں ہوتے۔ انکے افکار اشغال بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ مزید برآں ایک ہی انسان کا ایک دن حالات حاضر کے ماتحت دوسرے دن سے مختلف ہوتا ہے۔ پھر طبائع انسان میں تضاد بھی ہے۔ یہ سب اختلافات اگر انسانی تمدن کے لیئے ضروری ہیں تو پھر یہ کیا ضروری ہے کہ کل کے کل انسان ایک ہی طرح سوچیں اور اپنی نمازمیں ایک ہی بات کو زیر غور رکھیں جس حال میں انسان ہو جو بھی اسکا طریق زندگی یا صورتِ معاش یا وضع اشغال ہو اسکے سامنے تو اٹھو پہر اپنے اپنے حالات جداگانہ کے ماتحت ایک بہترین لائحہ عمل ہونا چاہیئے جس کے متعلق اُسے صحیح علم ہو ساں اُسکے سامنے اخلاق حسنہ کا تصور ہو۔ ان امور کے کیلیئے وہ اپنے آپ کو خدائے برتر کے آگے ذمہ دار سمجھے کیونکہ یہی ایک خیال بلاخیال معاوضہ کسی انسان کو نیک خیال و نیک اعمال کیطرف مائل کردیتا ہے اور اس خیال میں ایک خاص طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو خدا کے حضور میں کھڑا ہوا سمجھے اور اس خیال پر غور و فکر کرے۔ کیا اس غرض عالیہ کے حصول کے لیئے اسلام کی پانچ نمازیں کوئی تضیع اوقات ہیں۔ جب نماز کی ایک ایک رکعت میں سورۂ فاتحہ اسکے سامنے یہ باتیں لے آتی ہے یہ باتیں تو معمولی سے معمولی انسان بھی تصور میں لاسکتا ہے لیکن اگر انسانی دل و دماغ علم و عقل کی روشنی سے منور ہو اگر اسکا قلب نور عرفان سے آراستہ ہو تو پھر آن واحد میں اُن باقی امور عالیہ کا اسکے تصور میں آنا کوئی محالات سے نہیں تخیل کا پرواز۔ روشنی و آواز کی رفتار سے کہیں زیادہ اور برقی پرواز سے بھی بہت آگے بڑھا ہوا ہے ایک لمحہ میں وہ زمین سے آسمان تک پہنچکر سارے کی ساری اشیائے متعلقہ کو ذہن میں لاسکتا ہے۔ پھر جب خدا تعالیٰ نے

تعالیٰ نے انسانی نفس بالغ کو یہ طاقت بخشی ہو تو پھر سورہ فاتحہ نو وقتی حالات کے تحت خزائن بے بہا اسکے سامنے لا سکتی ہو ایک روشن دماغ کے سامنے تو ایک وسیع المفہوم لفظ ایک ثانیہ میں نیا جہان کی باتیں لے آتا ہے ۔

دوسرا اعتراض وہی ہو جو میرے کرمفرما لالہ جیون لال نے کیا۔ امور بالا تو تو ہی حقیقت ہو سکتے ہیں جب نماز کا پڑھنے والا الفاظ نماز سے آگاہ ہو۔ اور یہ امر صحیح ہو لیکن سورہ فاتحہ کے چند الفاظ کے معانی سے واقف ہوجاتا ہو۔ بقول قبلہ مولوی محمد علی صاحب کونسا مشکل امر ہو۔ علاوہ ازیں خود فلسفہ لسان ہر زبان کی بناوٹ اُنکی روز افزوں وسعت الفاظ معنی الفاظ کا نشیب و فراز تو اس مشکل کو بے حقیقت کردیتا ہو۔ ایک بچہ بھی جب اپنی مادری زبان سیکھتا ہو تو وہ زبان کے ہر ایک لفظ سے نا آشنا ہوتا ہو۔ ہر روز اُسے نئے سے نئے الفاظ کے معانی سے آشنا ہونا پڑتا ہو۔ انہیں الفاظ کا مجموعہ ایک دن اُسکی مادری زبان ہوجاتی ہو۔ جیسے ہر لفظ کے مفہوم پر وہ آخر کار قادر ہو جاتا ہو۔ دنیا کی کسی زبان کا کوئی لفظ ہو جب کوئی اُسکے مفہوم سے واقف ہوجائے تو وہ لفظ اُسکی مادری زبان کے الفاظ کے جا بجا ہو جاتا ہو۔ ہماری اُردو یا پنجابی زبان میں اسوقت اجنبی زبانوں کے ہزارہا الفاظ موجود ہیں اور آج تو ہماری عورتیں اور بچے تک بھی اپنی زبان بولتے ہوئے انگریزی کے بیسیوں الفاظ استعمال کرجاتے ہیں۔ اور اُنکے صحیح مفہوم سے وہ نا آشنا نہیں ہوتے۔ سورہ فاتحہ میں تو بیس نہیں بائیس الفاظ ہونگے اُنکے معانی کو کسی کے لیے ازبر کرلینا کونسا مشکل امر ہے خصوصاً جب سورہ فاتحہ کا دوسری زبان میں ترجمہ اُن مراتب عالیہ سے معرا ہو جاتا ہو۔ جو اُسکے مقدس الفاظ میں موجود ہیں اور جن کا نماز میں پیش نظر رکھنا بوجوہ بالا ضروریات سے ہو ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُعا اور اُس کی تاثیر

آج دعا کے منکرین اسکے قائلین سے کہیں زیادہ نظر آتے ہیں اور قائلین دعا میں بھی جو فلسفی مزاج ہیں اُن کے نزدیک دعا دِلی بخار یا دردِ پنہاں کے اظہار کا ایک ذریعہ ہی۔ اور یہ اظہار دل کو ٹھنڈا کر کے ایک قسم کی تسکین بخش دیتا ہے۔ اس تسکین و اطمینان کا نام، اِن فلسفیوں کے نزدیک قبولیت دعا ہے۔ پھر اس سے بڑھکر دعا پر ایک یہ بھی اعتراض ہوا ہی کہ ایک قائل دعا میں قوتِ عمل کمزور ہو جاتی ہے وہ امرِ پیش آمدہ کے پورا کرنے کے لیے اسباب ظاہری و ضروری سے تو تمسک نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے کل وقت کو دعا مانگنے یا منگوانے میں خرچ

کر دیتا ہے۔ اس نے دنیا میں بیکاری اور اپاہج پن کو پیدا کر دیا ہے۔ اور یہ بات صحیح بھی ہے۔ امر مشرقی ممالک میں دعا کے اس طرح کے جو قائل ہیں انکی اقتصادی حالت کی تباہی اس امر کی خود شاہد ہے۔ دعا کے اس غلط مفہوم نے بالخصوص مسلمانوں میں تو حالت جمود پیدا کر کے انہیں کہیں کا نہیں رکھا۔

حالات و خیالات بالا کی ذمہ دار ایک وہ بے تاثیری بھی ہے جو اسوقت کی دعاؤں میں نظر آ رہی ہے۔ دعائیں ہوتی ہیں لیکن ان میں تاثیر کہیں نظر نہیں آتی یا تو حاکم کائنات مجیب الدعوات ہی نہیں یا ہمارے اعمال ہمیں مستجاب الدعوات بننے کے قابل نہیں ٹھیراتے۔

بالمقابل دعا ایک فطرتی اور اضطراری تقاضا ہے۔ دنیوی حکام کے آگے بھی ہم دست حاجت دراز کرتے ہیں تو پھر کیوں ہم حاکم ازلی کے سامنے دست دعا نہ اُٹھائیں۔ اگر زمین کے بادشاہ ہماری خواہشیں پوری کر دیتے ہیں تو کیوں آسمان کا بادشاہ ہماری معروضات کو نہ سُنے۔ لیکن ان دنیوی حکام سے بھی وہی اپنی حاجات برآری کرا سکتا ہے جو ان حکام کی مقرر کردہ راہوں پر قدم زن ہو۔ اسی طرح اُس احکم الحاکمین کے دربار میں بھی پہنچنے کے کوئی راستے ہوں گے جن سے غالباً آج ہم ناواقف ہو چکے ہیں اور اسکا ثبوت یہ ہے کہ ہماری دعاؤں میں تاثیر نہیں رہی۔ ہماری دعا کچھ اس قسم کی ہونی چاہیئے جو نہ صرف دردِ پنہاں یا ضرورت لاحقہ کا اظہار ہی ہو بلکہ وہ ہم پر ظاہر کر دے کہ خدا کی جناب میں کون سی باتیں قابل پذیرائی

ہیں وہ کون سے امور ہیں جو دعا مانگنے سے پہلے ہم نے اپنے اندر پیدا کر لینے ہیں۔ اور جن کے نہ ہونے سے ہماری دعا نہ سنی جائے گی ہمیں مجیب الدعوات کی طرز ملکوت سے بھی اطلاع ہونی چاہیئے۔ یعنی ہمیں یہ علم ہونا چاہیئے کہ کسی امر کے حصول میں ہمیں دعا مانگنے سے پہلے کون سی باتیں خود کر لینی ہیں کہ جنہیں دیکھکر وہ برتر ہستی ہماری دعا قبول کرنے کو تیار ہو جائے معاملہ دعا میں ہمارے ذمہ کیا کام ہیں اور خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ کون سی باتیں ڈال رکھی ہیں ؞

آج جو لوگ دعا کے منکرین یا دعا کی تاثیر سے ہی مایوس ہو چکے ہیں وہ خود غور کریں کہ دعا کے وقت عامۂ دنیا کہاں تک امور بالا کو مدنظر رکھتی ہے ایک دنیوی حاکم سے کسی مقصد کے حاصل کرنے میں تو اظہار مقصد سے پہلے ہم وہ تمام باتیں پوری کر لیتے ہیں جو اس حاکم کے نزدیک قبولیت مقصد کے لیئے ضروری ہوں تو کیا اُس برتر ہستی کے ہاں جسکا ایک ایک کرشمہ اور جس کی ایک ایک بات اُسکے اپنے بنائے ہوئے قوانین سے باہر نہیں ہے دعا اور مقبولیت دعا کے متعلق بھی کوئی قوانین و اسالیب ہیں یا نہیں یہ تو مذہب یا الہام الٰہیہ کا فرض ہے کہ وہ ہمیں اُن اسالیب ربانی سے اطلاع دے۔ اور اگر الہام الٰہیہ نے ہی ہمارے لیئے کوئی دعا تجویز کی ہے تو وہ دعا اور اُسکے الفاظ ہی ہمیں ان اسالیب کی طرف متوجہ کر دیں۔ میرے ایمان اور میری تحقیق میں دعاء فاتحہ نے اس ضرورت کو بوجہ اتم پورا کیا ہے اور میں ان اوراق میں گو اجمالاً مگر کسی قدر تشریح کے ساتھ ان امور کے

بیان کرنے کی کوشش کروں گا ؛

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

ترجمہ کل حمد اُس اللہ کے لیئے ہے جو رب العلمین ۔ رحمٰن ۔ رحیم (اور) یوم الدین کا مالک ہی ۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی اعانت چاہتے ہیں ہم کو صراطِ مستقیم دکھلا (اور اُن کا رستہ (دکھلا) جن پر تیرا انعام ہوا نہ اُن کا رستہ جو غضب زدہ ہیں یا ضلالت میں ہیں ؛

عام طور پر ان آیاتِ مقدس کا ترجمہ اردو بالفاظ ذیل کیا گیا ہے :-

سب تعریف اللہ کے لیئے ہے جو بڑا مہربان اور رحم والا ہی ۔ مالک یوم الدین ہی ۔ تیری ہی ہم بندگی کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں ۔ ہم کو سیدھا رستہ دکھلا جن پر تو نے فضل کیا نہ اُن کا (رستہ) جن پہ تیرا غضب ہوا اور نہ اُن کا جو گمراہ ہیں ؛

یہ ترجمہ سورۃ فاتحہ کے مفہوم کو تو ظاہر نہیں کرتا حتّٰے کہ لفظ تعریف سے بھی لفظِ حمد کا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا ۔ عربی زبان نے لفظ حمد کو اُسی ستایش اور شکریہ کے اظہار کے لیئے وضع کیا ہے جو کسی کی سابقہ مہربانیوں کے متعلق ہو ۔ کسی مزید مہربانی یا انعام کی طلب میں اگر کسی کی تعریف یا

ستائش کی جائے تو ایسی تعریف یا ستایش کو عربی میں حمد نہیں کہتے بلکہ مدح کہتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ لفظ تعریف یا لفظ ستائش اُس باریک حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا۔ میں آگے چل کر دکھلاؤں گا کہ یہاں لفظِ مدح یا شکر کی بجائے لفظِ حمد کیوں استعمال کیا گیا۔ اسی طرح لفظِ مہربان یا رحم والا۔ رحمٰن اور رحیم کے مفہوم اور اُن میں جو لطیف فرق ہے اُسکو ظاہر نہیں کرتا۔ بعض غیر مسلموں نے اسمیں دھوکا کھایا اور کہا کہ جب رحمٰن اور رحیم دونوں کے مفہوم میں رحم تھا تو یہ تکرار قرآن کو فصاحت سے گرا دیتا ہے۔ یہ نادان کیا جانتے ہیں کہ اِن دو لفظوں میں کیسا لطیف سے لطیف فرق موجود ہے۔ یہی حالت باقی الفاظ کی ہے اسلیئے میں نے ترجمہ کرنے میں اُنہیں الفاظ کو قائم رکھا جو الہام خداوند نے استعمال کیئے ہیں

وہ اسمائے باری تعالیٰ جنکی عبادت (منشا پورے) کیئے بغیر کوئی امر سر انجام نہیں پاتا

دنیا جہاں کی دوسری الہامی غیر الہامی دعاؤں کی طرح سورۂ فاتحہ کا آغاز بھی اُن اسمائے الٰہیہ سے ہوتا ہے جو تعداد میں چار ہیں۔ لیکن یہ اسمائے خدا کی ستائش یا برتری کے بیان کرنے کے لیئے ہی تجویز نہیں ہوئے بلکہ یہ اسمائے حسنہ تو وہ ہیں جو اگر ایک طرف کُل کی کُل کائنات کو چلاتے نظر آتے ہیں تو دوسرے طرف ہمیں اُن راہوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں

جن پر چلنے کے بغیر ہم کسی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ یہ خدا کے پاک نام بالفاظ دیگر اُن چار دروازوں کیطرح ہیں کہ جن میں سے گزرنے کے بغیر اگر اسورِ روحانیات میں کوئی خدا تک نہیں پہنچ سکتا تو دنیوی امور میں جب تک کوئی انسان ان چار مقدس آستانوں پر جبینِ نیاز نہ رکھے وہ کسی خیر و خوبی کا مالک نہیں ہو سکتا۔ الغرض جس نے جو پایا وہ ان اسمائے باری تعالیٰ کے مطالبات کو پورا کرنے سے پایا۔

آج سے پچاس سال پہلے جس طرح ہستیٔ باری تعالیٰ کا ثابت کرنا مشکلات سے تھا۔ ایسے ہی آج عملی اکتشافات نے اُس وجود بزرگ کا انکار مشکل کر رکھا ہے۔ کائنات کے پسِ پردہ ایک ایسی گورنمنٹ نظر آتی ہے کہ جسکے وضع کردہ قھری (غالب) اور جبری قوانین کائنات کے ذرہ ذرہ پر مقتدرانہ حکومت کرتے نظر آتے ہیں۔ انکی اطاعت سے نہ صرف کسی کو مفر ہی نہیں بلکہ ہر ایک شئے کی ہستی اسکا قیام اور اسکی بلوغت و فلاح اسی اطاعت پر منحصر ہے۔ اس انتظامِ کائنات میں اور تو اور وہ حکومت خود بھی اپنے ہی وضع کردہ قوانین کی پابند نظر آتی ہے اگرچہ وہ اِن سب قوانین پر اقتدار کامل بھی رکھتی ہے (وَاللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰی اَمْرِہٖ) لیکن حاکم ازلی کی جناب سے وہی سورِ انعام ہو سکتا ہے جو ان محولہ بالا قوانین کی اطاعت و انقیاد میں اسکے سامنے حاضر ہوتا ہے انسان بھی تو انہیں محکوم و مجبور بالقوانین ذرات کائنات کا مجموعہ ہے پھر وہ کس طرح اپنی ہستی و برتری کیلئے اِس حکومت کے آئین سے آزاد ہو سکتا ہے

اس کا قیام اور اسکی بہبودیٔ تامہ بھی کلیتہً اسی حکومت کے ضوابط کے
کامل علم اور انکی اطاعت سے وابستہ ہی - یہ نظریہ ایک سریع الفہم امر ہے
کسی انسانی حکومت تلے بھی تو وہی معزز و محترم ہو سکتا ہے جو اُسکے
قوانین کے علم و اطاعت میں دوسروں پر ممتاز ہو -

یوں تو ہر انسانی جماعت کا تمدن و قیام ایک نہ ایک قسم کی حکومت
کو چاہتا ہے لیکن اُس جماعت کی معاشی، اقتصادی اور سیاسی ترقی
صرف اطاعت حکومت سے ہی نہیں بلکہ اُن آئین الٰہیہ (قوانین فطریہ)
کے علم اور اُس علم پر عمل کرنے سے وابستہ ہوتی ہے کہ جن کے ماتحت
کائنات کی ہر ایک شے اپنے اپنے خواص کو ظاہر کرتی ہے - انہیں
خواص کے علم کا نام سائنس ہے - آج وہی قومیں دنیا میں سرتاج
ہوتی ہیں جنہوں نے سائنس میں ترقی کی - یعنی دنیا کی وہی قوم حقیقی
فلاح کا منہ دیکھ سکتی ہے جو کائنات کے حاکم ازلی کے آئین و ضوابط
یا بالفاظِ دیگر **اخلاق ربانی** سے پوری واقف ہو - اور اُس قوم کے ہر
قول و فعل میں اُن اخلاق کی جھلک ہو جو قومیں اس وقت اقتصادی
امور میں طغرائے امتیاز رکھتی ہیں - عام اس سے کہ وہ خدا کی پرستار ہوں
یا دہریت پرست، اُنکی مادی ترقی بھی اُن آئین الٰہیہ کے علم سے ہی ظہور
میں آئی ہے جو اُس خالق حقیقی نے مادی اشیاء کے متعلق وضع کر رکھے
ہیں - وہ لاکھ ہستیٔ باری تعالیٰ کے منکر ہوں - لیکن جن قوانین فطریہ
(لاز آف نیچر) کی اطاعت کرتے ہوئے وہ موجودہ ترقی کو پا چکے ہیں

وہ تو باری تعالیٰ کے ہی تجویز کردہ ہیں۔ وہ تو وہی اخلاقِ الٰہیہ یا صفاتِ ربانی ہیں جو عملی صورت میں لاز آف نیچر کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ لاکھ ہستیِ باریتعالیٰ کے منکر ہوں۔ اُنھوں نے قانون کی پرستش کر کے مقنن حقیقی کی اطاعت کی ہے۔ الغرض انسان تمدن کی کسی منزل پر ہو وہ بادیہ نشین ہو یا کسی مہذب قوم کا فرد ہو۔ وہ دنیا میں زندہ تک بھی نہیں رہ سکتا جب تک وہ اُن انداز سے واقف نہ ہو۔ جن کے ماتحت اِس دنیا کے مالک نے اسے چلانا پسند کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی اس واقفیت میں کامل دستگاہ رکھتا ہو۔ لیکن اُس کے لیئے اس علم کا تھوڑا بہت حاصل کر لینا ضروری ہے"۔

اگر مذہب خدا کی طرف سے آیا ہے تو اُس کے من جانب اللہ ہونے کا لازمی ثبوت یہ ہونا چاہیئے کہ وہ انسان کو مذکورہ بالا انداز و اخلاق ربانی سے ایسی صورت میں اطلاع دے کہ جس سے ایک جاہل سے جاہل اور ایک عالم سے عالم اپنی اپنی حیثیت علمی کے مطابق مستفید ہو سکے۔ مذہب اگر آسمانی بادشاہت زمین پر لا کر دنیا میں انسان کو ایک ممتاز شہریت بخشنے آیا تو ہمیں اُسکے فرمانروا کے خط و خال سے اطلاع دے۔ ایسا ہی الہام اگر انسان کو اس بادشاہت سے معرف کرانے آیا تو جس کتاب کو وہ لائے۔ اُس میں اُس بادشاہت کا دستور اور چارٹر موجود ہو۔

آسمانی بادشاہت کو عامی نگاہ میں اخلاق اور روحانی امور سے ہی تعلق رکھتی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ غلط قیاس ہے کہ اس کا اس دنیا سے تعلق

نہیں۔ آخر روحانیت تو اخلاق کی صورتِ ابلغ اور اسکے ثمرات کا ہی نام ہے پھر وہ کون سے اخلاق ہیں جن کا گہرا تعلق ہمارے معاشری اور مجلسی فی الجملہ دنیوی امور سے نہیں۔ سخاوت فیاضی مواساتِ ہمدردی شجاعت نصفت شعاری وغیرہ وغیرہ ہی اخلاقِ فاضلہ اور روحانیات کی اساس ہیں۔ ان کا بہترین ظہور ہی ہمارے کامل اقتصادیا معاشرت و معاشیات کی بہتر حالت کے سوا نا ممکن ہے۔ مجھے تو اخلاقِ عظیمہ کی ایک شاخ بھی ایسی نظر نہیں آتی کہ جس کی بہترین آبیاری کے لیے روپے پیسے کی ضرورت نہ ہو خیرات وحسنات بھی زر و مال سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ پھر کیا اِس کائنات کی چیزیں جن کا نام روحانیت کے محدود مفہوم نے جیفۂ دنیا تجویز کیا ہے وہ وہی زینت نہیں جسکے متعلق قرآن پاک نے صحیح طور پر فرمایا:-

مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ

ترجمہ (کس نے اللہ کی زینت کو جو اُسنے اپنے بندوں کے لیے نکالی ہے حرام کیا ہے)۔

کسی چیز کا استعمال ہی اُسے نعمت یا لعنت بنا دیتا ہے۔ بذاتہٖ تو یہ چیزیں بُری نہیں۔ آخر ان سب چیزوں کو آسمانی بادشاہت کے مالک نے ہی اپنے بندوں کے لیے پیدا کیا۔ الغرض ہماری مادی اور اقتصادی حالت کی بہتر صورت ہی اخلاقِ حسنہ پیدا کر کے مولدِ روحانیات ہو جاتی ہے۔ اسلیئے ہر انسان کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنی معاشی معاشری منزلی، مجلسی، اقتصادی اور سیاسی حالت کے بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ اور اپنی محنت کے ثمرات

وکسب کو خلق خدا کے فائدے میں صرف کر کے اخلاقِ فاضلہ اور روحانیت کا مالک بن جائے ۔

الغرض آسمانی سلطنت میں (جس میں زمین اور اہل زمین بھی شامل ہیں) خدا کی نگاہ اور ایسے ہی دنیا کی نگاہ میں وہی ممتاز ہے جو خدا کی راہوں سے واقف ہو گئے اور ان راہوں میں وہ راہیں بھی شامل ہیں جن کا تعلق مادی اشیائے کائنات سے ہے۔ انہیں راہوں کا تھوڑا بہت علم سائنس نے دیا ہے ہم سائنس سے واقفیت نہ بھی رکھتے ہوں۔ ہم اُن ربانی راہوں (اخلاق الٰہیہ) کے علم کے بغیر تو ایک لمحہ کے لئے بھی جی نہیں سکتے جنسے رب کائنات نے ہماری حیات اور ہماری ہر قسم کی ترقی کو وابستہ کر دیا ہے۔ اگر مذہب خدا کی طرف سے آیا تو اسکا فرض اولین یہ ہے کہ وہ ہمیں ان مذکورہ راہوں سے اطلاع دے۔ ہمیں اپنے بادشاہ حقیقی کے اوضاع واطوار اور اسکی طرزِ حکومت، اُسکے جزا وسزا کے قوانین، اسکی جناب سے حصول انعام (دینی یا دنیوی) کے طریق اور اسکے عذاب وعقاب کے انداز سے آگاہ کرے یعنی اقتصادی معاملات میں اگر علمی اکتشافات متمدن قوموں کو ربانی راہوں سے واقف کر دیتے ہیں تو مذہب دوسرے لوگوں کو جو سائنس سے تھوڑے واقف ہیں، نہایت آسان طریق پر ان اخلاقِ خداوندی سے مطلع کر دے یعنی جس طرح بقاو حیات کی جدو جہد اور اقتصادیات کی دوڑ دھوپ میں مہذب مادیت پرست قوموں کی رہنمونی سائنس کر رہی ہے اسی طرح سائنس نہ جاننے والی قومیں جب تک کہ وہ علمی حقائق سے بہرہ اندوز

ہوں۔ اِن امور میں مذہب سے ہدایت یاب ہو جائیں بلکہ مذہب تو نہایت سادے اور موٹے الفاظ میں اُن چند صفاتِ الٰہیہ کا خصوصاً پتہ دیدے کہ جن کی اتباع میں نہ صرف ہماری اخلاقی اور روحانی حالت ہی سنور جائے بلکہ ہم اپنے مادی معاملات کو بھی بہتر سے بہتر کر سکیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے ہی یہ سب کے سب اسباب دنیا بنائے اور ان سے ہماری خوشحالی کو وابستہ کر دیا اور یہ سب اسباب خدا کی کسی خاص صفت کے ماتحت ہی نفع رساں ہوتے ہیں تو پھر مذہب ہمیں اُن صفات سے اطلاع دے تاکہ ہم انہیں پیش نظر رکھکر ان دنیوی اسباب سے کامل طور پر متمتع ہوں۔ اگر ہم اِس دنیا میں بھی حکومت خداوندی سے باہر نہیں ہو سکتے تو پھر مذہب ہی اُس حکومت کے قوانین سے اطلاع دے۔

یوں تو قرآن کریم مختلف مقامات پر مذہب و الہام کی مختلف ضرورتیں بیان کرتا ہے۔ لیکن ان میں اُس نے ضرورت بالا کا ذکر بھی سورہ بقرہ کے آخری رکوع میں کیا ہے۔ وہاں کتاب پاک فرماتی ہے کہ زمین و آسمان پر

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ ترجمہ: اللہ ہی کا

(بقرہ ع ۴۰)

اُس خدائے برتر کی حکومت ہی جو انسان کے اندرونی، بیرونی حالات سے واقف ہی۔ اور وہ اپنی مشیت سے اُن حالات کے مطابق انسان پر جزاو سزا مرتب کرتا ہے۔ اسلیئے اُس نے مختلف قوموں میں رسول بھیجے اور اُن کے ذریعہ دنیا کو اپنی منشار کی اطلاع دی۔ جس منشار کی مطابقت یا مخالفت سے انسان اور یہ دونوں باتیں انسان کے اپنے ہی اختیار میں ہیں۔ جزاو سزائے الٰہی کا مستوجب ہوجاتا ہے۔ اسی منشار کی منضبط شکل کا نام تعلیم مذہب یا کتاب اللہ ہوتا ہے۔

ہاں یہ سچ ہے کہ کل تعلیمات مذہبی یا بالفاظِ دیگر تمام کی تمام ربانی صفات و اخلاق بغرض اتباع تو آخر ہر انسان کی نگاہ کے سامنے نہیں رہ سکتے اور یہ میں واضح کرچکا ہوں کہ جن کا نام مذہب نے صفات یا اخلاقِ باری رکھا ہے وہ وہ ربانی انداز ہیں جنکے ماتحت کائنات چل رہی ہے اور انہیں کے علم کا نام حقیقی سائنس ہی لہذا انسان کی روزانہ زندگی میں کوئی ایسی

بقیہ ترجمہ صفحہ ۳۳) جو کچھ کہ آسمانوں میں ہی اور جو کچھ کہ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہی یا اُسے چھپاؤ اللہ اسکے مطابق تم سے حساب لیگا۔ پھر وہ جسکو چاہے مغفرت کرے اور جسکو چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ رسول اسپر ایمان لاتا ہے جو اسکے رب سے اسکی طرف اتارا گیا اور مومن بھی) اللہ پر اور اسکے فرشتوں پر اور اُسکی کتابوں پر اور اُسکے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں ہم اسکے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے اور کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے فرمانبرداری کی۔ اسے ہمارے رب! تیری مغفرت مانگتے ہیں اور تیری طرف ہی انجام کار پہنچنا ہے۔ اللہ کسی شخص پر کچھ مشقت نہیں ڈالتا مگر (جو) اُس کی طاقت ہو۔ اسی کے لیے ہے جو وہ اچھی کمائی کرے اور اسی پر ہے جو وہ (بری) کمائی کرے۔

سورۂ بقرہ آیت ۲۸۴ - ۲۸۵

بات بھی ہونی چاہیئے جو اُسے مذکورہ بالا ربانی انداز کو یاد دلاتی ہے۔ اور اُن کی روشنی میں وہ مادی، اخلاقی اور روحانی امور میں صراطِ مستقیم سے اِدھر یا اُدھر نہ ہوسکے۔ اِس غرض کو پورا کرنیکے لیے اسلام نے پنجوقتہ نماز تجویز کی اور نماز کی جزوِ اعظم سورہ فاتحہ کو ٹھیرایا۔

سورہ فاتحہ کا آغاز خدا کی جن چار صفات سے ہوتا ہے وہ دراصل باقی کی کل صفاتِ الٰہیہ مندرجہ قرآن مجید کا مجموعہ ہیں یعنی یہ چار شاہ راہیں ہیں۔ جنکے تحت میں باقی کل کی کل ربانی راہیں آجاتی ہیں۔ اور یہی وہ راہیں ہیں جنکے ماتحت کائنات پر حکومت الٰہیہ دائر و سائر ہے اور انہیں پر چلنے سے ہم ہر رنگ میں، وہ مادی ہو یا غیر مادی ہر قسم کا کمال حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ چار صفات حسب ذیل ہیں۔ اُنکی عبادت یہی ہے کہ ہم اپنے ہر فعل

(۱) رب العٰلمین (۲) رحمٰن (۳) رحیم (۴) مٰلک یوم الدین۔

اِن صفات کا مفہوم کامل اور اُن کا اتباع ہماری ہر ترقی کا کفیل ہوسکتا ہے۔ اوّلاً میں اِن اسمائے حسنہ کے وہ خط و خال یا معانی بیان کردیتا ہوں جنہیں مختلف پیراؤں میں خود قرآن حکیم نے بیان کردیا ہے بعدہٗ

رب العٰلمین

جس طرح یہ چار صفات ربانی باقی صفات الٰہیہ کے لیئے بطور اُم کے ہیں اِسی طرح لفظ رب کا مفہوم بھی ایک حد تک رحمٰن۔ رحیم اور مالک یوم الدین کے مفہوم پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یعنی ربوبیت اپنے عمل میں رحمانیت رحیمیت

اور مالکیت کو اپنے اندر داخل کر لیتی ہے۔

رب کے معنی نہ صرف پیدا کنندہ اور پالن ہار کے ہی ہیں۔ جیسے کہ عام طور پر دنیا نے سمجھ رکھا ہے بلکہ رب وہ ہستی ہے جو ہر ایک چیز میں استعداد مخصوصہ رکھکر اُس چیز کے جوہر مخفیہ کو بلوغت یا کمال تک پہنچانے کا کام بھی خود ہی کرتی ہے۔ مثلاً ایک بیج کا زمین میں دفن ہوکر باثمر درخت ہوجانا مختلف منازل کو چاہتا ہے۔ اور ہر منزل پر اُس بیج کی آبیاری اور پرورش مختلف حالات اور مختلف خوراکوں کو چاہتی ہے۔ رب وہ پاک ہستی ہے جو بیج میں درخت بننے۔ پھول لانے۔ پھل دینے کے خواص اور پھل میں طرح طرح کی تاثیرات رکھ دیتی ہے۔ پھر اس بیج نے مذکورہ بالا ترقی کے لیے جن منازل (عالمین) میں سے اس نے گزرنا ہوتا ہے۔ وہ ہستی نہ صرف پہلے ہی سے اُن منازل کو تجویز کرتی ہے بلکہ ان منازل کی ضروریات بھی مہیا کرتی ہے۔ یہی حالت کائنات میں ہر مخلوق کی ہے۔ پھر وہ ہستی منتظم اور منظم بھی ہے۔ یعنی اُس نے قوانین بھی مقرر کیے ہیں۔ اور ہر طبیعت میں اُن خواص پر چلنے کی استعداد اور قابلیت بھی رکھ دی ہے وہ ہستی ان اپنے قوانین کی ہدایت بھی ہر ایک مخلوق کو دیتی ہے۔ پھر اُس برتر ہستی نے ہر ایک مخلوق کے متعلق تادیب و تہذیب کے قاعدے بھی مقرر کر دیئے ہیں۔ یعنی اگر کوئی چیز اس اپنے سفر بلوغت میں ربانی راہوں سے اِدھر اُدھر ہوکر غلط قدم اٹھائے جس غلطی سے اُسکی ترقی میں فرق آجائے۔ اور

وہ اپنے کمال تک نہ پہنچ سکے تو ربانی قوانین تادیب و تہذیب اُس کی اصلاح میں لگ جاتے ہیں۔ ان قوانین کا نام اصطلاح قرآنی میں عذاب رکھا گیا ہے۔ ہر ایک چیز کی پیدائش اور اسکا قیام و نمو لکھو کہا اور چیز وانکو بھی چاہتا ہے جو کائنات میں ایک دوسرے کی خادم مخدوم نظر آتی ہیں اس لیئے اُس برتر ہستی نے اِن سب اشیاء کے مختلف عالم پیدا کر دیئے ہیں جو مختلف قوانین کے ماتحت اپنے اپنے ہاں منازلِ ارتقاء طے کر کے اپنی اپنی خدمات میں لگے رہتے ہیں۔ اور اُن سے تمام اشیائے عالم مستفید ہوتی ہیں۔ فی الجملہ جس حقیقت کو آج حکمائے مغرب نے ایوولیشن (ارتقاء) کے نام سے موسوم کر رکھا ہے اسکی سب مثالیں لفظ ربوبیت کے مذکورہ مفہوم میں آجاتی ہیں۔ ربوبیت کے ان معانی کی طرف ہمیں آج کے دریافت کردہ مسئلہ ارتقاء نے متوجہ نہیں کیا بلکہ لغت[۱] عرب نے اِس لفظ کے یہ معنی بھی لکھے ہیں۔

۱؎ تاج العروس۔ لسان العرب، انگریزی لغت عرب مصنفہ لین پول۔ مفردات امام راغب وغیرہ وغیرہ۔ ایوولیشن (مسئلہ ارتقاء) سے میری مراد ڈارون کا نظریہ نہیں یعنی بندر سے انسان کا پیدا ہونا ہم اسقدر قائل ہیں کہ مختلف چیزیں اپنی ترقی میں الگ الگ سفر بلوغت طے کرتی ہیں مثلاً جو اثیری ذرات ابتدا سے ترقی کرتے کرتے آخر کار انسان بن گئے وہ ذرات کسی منزل پر بندر بنکر بعد میں انسان نہیں بنے بلکہ ہر ایک مخلوق کا دائرہ عمل جدا جدا ہے خواہ سفر بلوغت میں وہ لکھو کہا عالمین میں سے ہو کر گزرے۔ اصول ایوولیشن سے ہم یہی سمجھتے ہیں کہ جس چیز نے جو کچھ بننا ہوتا ہے اسکی کل کی کل استعدادیں اسکے جوہر میں ابتداء سے ہی موجود ہوتی ہیں۔ یہ جوہر مختلف منازل میں مختلف عوارض و لباس پہنتا۔ اور ان لباسوں کو اتارتا آخر کار بلوغت مقررہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر ہم کسی آنیوالے عالم یا حیات مابعد کے قائل ہیں تو اس مسئلہ ایوولیشن کی بنیاد پر قائل ہیں۔ انسان کے اندر ہمیں صدہا ترقیات کے جوہر نظر آتے ہیں جو یہاں بالغ نہیں ہوتے اُن جواہر مختصہ کا ظہور کامل ایک اور عالم کو چاہتا ہے جو حیات بعد الموت سے تعلق رکھتا ہے ۱۲

یہ مختصر اوراق لفظ رب کی کامل تشریح کے حامل نہیں ہو سکتے
اس پر مفصل بحث ان شاء اللہ میں عنقریب ایک اور کتاب میں کرونگا
یہاں مختصراً یہ کہنا کافی ہوگا کہ لفظ رب کے معنی و مفہوم کو نناوے کیفیات
مختلفہ تو وہ صفات باری تعالیٰ ہیں جو قرآن کریم نے مختلف مواقع پر
برنگ اسمائے حسنہ بیان کی ہیں۔ اور وہ سب کی سب صفات، رب اللہ
رحمٰن، رحیم، مالک کی ہی تفسیریں ہیں۔ ہاں لفظ رب کی جس خصوصیت
کی طرف میں مسلم غیر مسلم احباب کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ رب
العالمین نے ہر ایک چیز کے پیدا کرنے اور اسکو بلوغت تک پہنچانے سے
پہلے اسکے متعلق قوانین بنا دیئے ہیں اسکی کیفیت و کمیت کے اندازے
بھی مقرر کر دیئے ہیں۔ اس کیفیت اور کمیت کے مطابق تربیت کے
سامان پیدا کرکے مخلوقات کو ان تمام قوانین کی ہدایت کر دی ہے
اور ہر مخلوق میں ان قوانین پر چلنے کی استعداد بھی رکھ دی ہے۔ لہذا
رب العالمین کی جناب سے وہی مورد انعام ہو سکتا ہے اور وہی پھلتا پھولتا
ہے جو ان مقامات ربی سے آگاہ ہو اور اپنے قول و فعل کو ان کے
مطابق کرے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتٰنِ کا یہی مفہوم ہے یعنی
وہی خوش حالی اور کامیاب زندگی کو یہاں اور وہاں یقیناً پائیگا۔ جو ان
مقامات ربی کا لحاظ کرے اور جو لحاظ نہ کرے وہ کبھی پھلتا پھولتا نظر نہ
آئے گا۔ بلکہ قوانین ربوبیت نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ ایسی نامراد ہستیاں
نہ صرف ذلیل و خوار ہی ہوں بلکہ ان کا وجود بھی اس ہستی سے مٹا دیا جائے

کیونکہ وہ اپنے جوہر کو اپنی بدبختیوں سے ایسا ناقص کر دیتے ہیں کہ
وہ زندہ رہنے کے قابل نہیں رہتا۔ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ
فَسَوَّاهَا۔ فی الجملہ وہی شخص اپنے کاروبار میں بہبودی کا منہ دیکھیگا
جو اپنے دائرہ اعمال میں رب العالمین اور اُسکے طریق ربوبیت کا
ظل بن جائے اور اس کے کام ربانی کام کے عکس ہو جائیں ورنہ وہ ہر جگہ
خائب و خاسر ہوگا۔ آج مسلمان اگر اقتصادی معاملات میں ناکام ہیں تو اسلیے
ہے کہ وہ رب العالمین کی راہوں کو بھول گئے ہیں جس میں

رحمٰن

اجمالاً تو تشریح بالا میں لفظ رحمان کی حقیقت آچکی ہے لیکن
اس اجمال کی وضاحت میں یہ عرض ہے کہ رب العالمین نے اشیاء
کائنات کی پیدایش و پرورش میں جو قوانین مقرر کر دیئے ہیں۔
ان قوانین کا نفاذ کسی مواد اور مصالحہ کو بھی چاہتا ہے۔ پانی اگر دو
ہواؤں (اوکسیجن۔ ہائیڈروجن) کی ترکیبِ خاصہ سے پیدا ہوتا ہے
تو پانی کے پیدا ہونے سے پہلے اِن دو ہواؤں کا موجود ہونا ضروری
ہے۔ کل کی کل اشیائے کائنات جو اِس وقت مختلف شکلوں اور
ہیولوں میں نظر آتی ہیں۔ وہ سب کی سب ہزارہا اور لکھو کھا منازل
(عالمین) ارتقاء کو طے کر کے موجودہ شکل تک پہنچی ہیں۔ اور ان سب کا
خلاصہ اس زمین پر حضرتِ انسان ہے۔ ہماری تحقیق جدید نے جس
ابتدائی سے ابتدائی منزل ارتقاء کو دریافت کیا ہے وہ اثیری ذرات
ہیں۔ رب العالمین کی حکمتِ بالغہ نے لا تبدیل قوانین کے ماتحت

ان ایتھر کے ذرات میں آئندہ کے مختلف عالمین میں سے گزرنے اور
ان عالمین کی متعلقہ شکلیں اختیار کرنے کی استعداد بھی رکھدی ہے
اور اس ضروری رزق کو بھی پہلے سے ہی پیدا کر دیا ہے جو ہر منزلِ
سفر میں ان ذرات کی ترکیب سے نے بغرض نشو و نما حاصل کرنا ہے
رب العالمین کی اس صفت یا اُسکے اس تخلق کا نام قرآنی اصطلاح
میں رحمٰن ہے۔

مثلاً انسان اپنی پیدایش اور اپنی زندگی کے لیئے کل کی کل
اشیاءِ کائنات کی قبل از وقت موجودگی کا محتاج تھا: زمین آسمان
آفتاب ۔ستارے ۔سیارے ۔ بادل ۔ہوا۔ پانی ۔شجر ۔حجر۔ الغرض
کائنات کی یہ ساری چیزیں اگر موجود ہوں تو ہم پیدا ہو سکتے
تھے ۔یا زندہ رہ سکتے ہیں۔ پھر انسان کی تربیت اور اُسکا تمدن
لاکھوکھہ در لکھوکھہ چیزوں کی موجودگی چاہتا تھا۔ ہماری خورش و
نوش ۔ہمارے ملبوسات ۔ ہمارے گھر اور سوسائٹی کی آسایش
کی چیزیں ساری کی ساری ہمارے کسی عمل کا نتیجہ تو نہیں ہوئیں
خود ہمارا عمل کسی موجود شدہ مواد کو چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ سب کا سب مواد
پہلے ہی سے موجود ہے۔ لکڑی ۔ لوہا ۔ اگر نہ ہو تو ہماری آسایش
اور آرام کی چیزیں کہاں سے پیدا ہوں زمین ہوا اور بادل
نہ ہوتے تو ہمارے دستر خوان پر طرح طرح کی چیزیں کہاں سے آتیں
آج سائینس کی طفیل طرح طرح کی ایجادات نے ہمیں کہاں کا کہاں

پہنچا دیا ہے۔ لیکن وہ کون سی ایجاد ہے جو خدا کی پہلے سے بنائی ہوئی چیزوں کی ترکیب سے تعلق نہیں رکھتی۔ پھر ان چیزوں کے خواص جنکی دریافت موجب ایجادات ہوتی ہے۔ چیزوں میں پہلے سے ہی موجود ہیں سائنس نے خواص اشیاء پیدا نہیں کیے بلکہ پیدا شدہ خواص کو دریافت کیا ہے۔ یہ سب کا سب **فیض رحمانیت** سے موجود ہوا۔ فی الجملہ ہر ضرورت موجودہ یا ضرورت آیندہ کے دفعیہ کے جو اسباب ضروریہ ہیں وہ رحمانیت نے ضرورت کے پیش آنے سے پہلے پیدا کر رکھے ہیں انسان جو چاہے اُسکی خواہش کے پورا کرنے کے سامان پہلے ہی سے موجود ہیں۔ ہاں اُسکا فرض ہی کہ وہ ان اسباب کو دریافت کرے اور ان اسباب کو جمع کر کے اپنی ضروریات کو پورا کرے۔ اور تو اور ان اسباب کی تلاش و ترکیب کے لیے انسان کو جن قوائے کی ضرورت تھی وہ قوائے بھی رحمان خدا نے انسان کو پہلے سے ہی دے رکھے ہیں۔ انسانی قوے میں جو ممتاز قوائے ہیں وہ انسان کے کان۔ اُسکی آنکھیں اور اس کا دل ہے۔ ان قوائے ثلاثہ کا ذکر قرآن کریم نے خاص طور پر کیا ہے۔ اور ان کو نعمائے الٰہی میں شمار کیا۔ اب وہ کونسی بات ہی جو ہماری ہستی ہمارے قیام ہماری بہبودی و ترقی اور راحت کے لئے تو ضروری ہو اور وہ فیض رحمانیت نے پہلے ہی سے پیدا نہ کر رکھی ہو۔ یہ فیض رحمانیت کسی عقیدہ یا ایمان یا عمل کی خصوصیت سے وابستہ نہیں۔ اس رحمت کے دروازے مسلم مومن کافر بے ایمان صاحب عمل یا بے عمل حتےٰ کہ ایک منکر و دشمن باریتعالےٰ پر بھی یکساں

کئے ہوئے ہیں جو اِن سے تمسک کرے وہ فیضیاب ہوجائے گا۔

رَحِیْم

الغرض فیض رحمانیت نے ایک وسیع دسترخوان بچھاکر صلائے عام دے رکھی ہے۔ لیکن اس دسترخوان کی نعمتیں گھر بیٹھے کسی کے منہ میں ازخود نہیں چلی جاتیں۔ اِن کو وہی کھا سکتا ہے جو اس دسترخوانِ باقی پر بیٹھنے کی اہلیت رکھے فیوض رحمانیت سے وہی مستفید ہوسکتا ہے جو قوانین رحیمیت کی عزت کرے رحمانیت اگر اپنی رحمت کے نیچے بلا معاوضہ کل دنیا کو لے آتی ہے تو رحیمیت معاوضہ لیئے بغیر فیض رساں نہیں ہوتی۔ اُسکے فیض سے وہی مستفیض ہوسکتا ہے جو فیض رحمانیت کو اپنے زیر عمل لائے۔ مثلاً ہماری خوراک اناج سے بھی وابستہ ہے لیکن ہم غلے کا ایک دانہ بھی پیدا نہیں کرسکتے۔ جب تک زمین میں غلہ کے پیدا کرنے کی استعداد اور غلہ کی پیدائش کے مواد موجود نہ ہوں لیکن یہ سب کے سب بیکار ہیں جب تک آسمان سے پانی نہ آئے اور پانی کو ہوا۔ بادلوں میں جمع نہ کرے پھر اِن کا تعلق بذاتِ خود اختلاف لیل و نہار سے ہے اور اُس اختلاف کا انحصار گردش زمین پر ہے۔ پھر زمین کے پھلوں کے پکانے میں سورج، چاند اور کل کی کل ساوی دنیا امداد دیتی ہے۔ الغرض اگر ساری کائنات بحیثیت مجموعی کام نہ کرے زمین میں سے ایک دانہ بھی پیدا نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ کل کی کل کائنات اُسی وقت کام کرتی ہے جب ہم آلاتِ کشاورزی کو لیکر کھیتوں میں جائیں۔ اِس کائنات

کو خدائے تعالیٰ نے ہمارے مسخر[1] تو کر دیا لیکن یہ تسخیر ہمارے ہاتھ ہلائے بغیر اپنے جوہر نہیں دکھلاتی۔ ہمارے رزق کے لیئے اِن تمام چیزوں کا ہونا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمانیت سے کائنات کی ان تمام چیزوں کو ہماری نسل کی پیدائش سے لکھو کھا سال پہلے ہی پیدا کر دیا۔ اور ان سب میں ہماری فائدہ رسانی کے خواص بھی رکھ دیئے۔ اور ان تمام کی تمام چیزوں کو اسی فیض رحمانیت سے ایک لاینفک طریق پر ایک دوسری سے مربوط بھی کر دیا لیکن یہ سب کی سب اُسیوقت انسان کو فائدہ پہنچا سکتی ہیں جب انسان کیطرف سے کوئی عمل شروع ہو۔ اور اگر ایک عمل شروع ہو تو اس کا معاوضہ بیشمار ہوتا ہے۔ ہمارا ایک فعل سَو ثمرات پیدا کرتا ہے بقول حضرت سیدالمرسلینؐ اگر ہم ایک قدم خدا کی طرف اٹھائیں تو خدا سَو قدم ہماری طرف اُٹھاتا ہے۔ اگر ہم کھیت میں ایک دانہ ڈالیں تو خدا تعالیٰ کیطرف سے ہمیں سَو دانے ملتے ہیں۔ اِس رحمت کا نام قرآنی اصطلاح میں رحیمیت آیا ہے۔ خدائے واحد نے ہمارے نفع کے لیئے ایسی چیزیں تو پیدا کر دیں جن کا پیدا کرنا ہماری قدرت سے باہر تھا۔ لیکن قانون رحیمیت کے تحت ہم اُن سے اسی وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب ہم قدم اٹھائیں۔ اگر ہماری طرف سے کوئی حرکت شروع نہ ہو تو ہم فیض رحمانیت سے بالکل محروم ہو جاتے ہیں۔ میرے مسلم بھائی خوب یاد رکھیں کہ فیض رحمانیت تو سب کے لیئے عام ہے لیکن رحیمیت قطعاً قطعاً کام کرنے والے کے حصہ میں ہی آئی ہے۔ ہماری خوش اعتقادیاں یا صحیح عقیدے عمل کے بغیر کل کے کل

[1] وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض۔ ترجمہ: زمین و آسمان کی اشیاء کو تمہارے قابو میں کر دیا ۱۲

بے سود ہیں۔ رحمانیت اور رحیمیت کی اس حقیقت کو اور انکی ایک دوسرے کیساتھ وابستگی کو قرآن کریم نے ذیل کے مقدس الفاظ میں بیان فرمایا ہے

وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ وَالْفُلْکِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِہِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا وَبَثَّ فِیْھَا مِنْ کُلِّ دَآبَّۃٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۔

یہ آیات کسی مزید تشریح وتفسیر کی محتاج نہیں۔ اِن مقدس الفاظ نے اُن تمام کائنات کی موٹی موٹی چیزوں کو گن دیا ہے جن کے ساتھ ہماری آسائش کی کل چیزیں وابستہ ہیں۔ اور ان کا تعلق رحمانیت اور رحیمیت سے وابستہ کر دیا ہے۔ یعنی رحمانیت نے یہ ساری چیزیں پیدا کر دیں۔ لیکن ان کی فیض رسانی رحیمیت کے ماتحت ہی ہوتی ہے۔

یہاں میں مسلم بھائیوں کو دو باتوں کی طرف متوجہ کرتا ہوں ایک

لہ ترجمہ:۔ اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اُسکے سوا اور کوئی معبود نہیں وہ رحمن رحیم ہے۔ بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات اور دن کے ردوبدل میں اور کشتیوں میں جو سمندر میں لوگوں کو نفع پہنچانے کو چلتی ہیں۔ اور پانی میں جو اللہ بادل سے اتارتا ہے۔ پھر اسکے ساتھ زمین کو اسکے مرنے کے بعد زندہ کرتا ہے اور اسکے اندر ہر قسم کے جانور پھیلاتا ہے اور ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان کام میں لگایا گیا ہے۔ اِن لوگوں کے لیے یقینی نشان ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں ۱۲

(سورۂ بقرہ۔ آیت ۱۶۳ - ۱۶۴)

تو یہ چیزیں ہر انسان کے لیے پیدا ہوتی ہیں جس کی طرف بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ (جیسے انسان کو فائدہ ہو) اشارہ کرتا ہے۔ یہ چیزیں صرف مسلمانوں کے لیے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ ہر مسلم یا غیر مسلم انسان کے نفع کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔ اور فیض رحیمیت کے ماتحت ان سے مستفید وہی ہوگا جو لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ (یہ چیزیں عقلمندوں کے لیے آیات ہیں) کا مصداق ہوگا۔ عام اس سے کہ کسی کا کوئی عقیدہ ہو جو علم وعقل کی روشنی میں ان فیوضاتِ رحمانیت سے کام لیگا۔ وہی اس دنیا میں اپنے اقتصادی، معاشی اور سیاسی امور میں معزز وممتاز ہوگا۔ خوش اعتقادی کو چھوڑ دو۔ واقعاتِ عالم کو دیکھو۔ آج اقتصادیات، معاشرت اور سیاسیات میں وہی قومیں سب سے آگے ہیں جنھوں نے مندرجہ بالا اشیائے کائنات پر غور کیا۔ ان کے خواص کے متعلق علم حاصل کیا اور اپنے علم وعقل کی روشنی میں انہیں برتا۔ اور تو اور ہم معاشی حالت کے لحاظ سے اس وقت کس مپرسی میں آچکے ہیں۔ کروڑہا مسلمان نانِ شبینہ تک کے محتاج ہو چکے ہیں۔ اس حالت کا ذمہ دار کون ہے۔ رحمانیت نے تو ہم پر بھی وہی دروازے کھولے ہوئے ہیں جن سے متمدن قومیں بنتی ہیں لیکن رحیمیت کے دروازوں کو ہم نے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری دنیوی بہبودی تو کلیۃً اشیائے کائنات کے صحیح علم اور ان کے طریق استعمال پر منحصر ہے لیکن عالم اسلام میں وہ کونسی قوم ہے جو آج اس مطلوبہ علم وطریق استعمال کی طرف جارہی ہے پھر

ہم کیوں رہ رہے ہیں۔ ہم وہ ہیں جن کی نگاہ دوسروں کی پس خوردگی پر ہے۔ پھر ہمارا اُنہیں کا سا حال ہونا چاہیئے جو پس خوردہ کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔

یاد رکھو رب العالمین مسلمانوں کا نہیں سب قوموں کا رب ہے۔ اُسکی رحمانیت سب کے لیئے ہے لیکن اُسکی رحیمیت کا مورد وہی ہے جو صاحب عمل ہو۔ جو کام کرے جو ہاتھ پاؤں ہلائے۔ اپاہج سے اور بیکار رہنے والے سے خدائے رحمٰن و رحیم کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ سچ ہے اور آثار میں بھی ایسا ہی آیا ہے کہ رحمٰن تو مومن کافر سب کا ہے مگر رحیم صرف مومن کا ہے۔ لیکن کیا ہم مومن ہیں۔ ایمان تو عمل کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایمان حقائق کے علم اور اس علم پر عمل کرنے کا نام ہے۔ یعنی جب تک یہ علم و عمل جمع نہ ہوں ایمان کامل نہیں ہوتا جس طرح دینیات میں علم و عمل کی ضرورت ہے ویسے ہی دنیوی امور میں یہ علم و عمل (ایمان) بھی ضروری ہے۔ معاش کے حصول میں ہم اس وقت مومن نہیں رہے۔ کیونکہ جن حقائق کے علم سے حُسن معاش وابستہ ہے اُس علم کو نہ تو ہم حاصل کرتے ہیں اور نہ اُس علم کو عمل میں لاتے ہیں بلکہ اس غفلت کے باعث ہم رب العالمین کے تعزیری قانون کے نیچے آچکے ہیں جو اُسکی صفت مالکیت کے ماتحت دنیا میں کام کر رہا ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

عام محاورہ نے اسکے معنی "جزا سزا کے دن کا مالک" کیئے ہیں لیکن ان الفاظِ بالا میں رنگ تعمیم کا بھی ہے۔ عربی زبان میں لفظ یوم بہت ہی وسیع المفہوم واقع ہوا ہے۔ وقت کی کسی مقدار کو یوم کہتے ہیں خواہ وہ ایک ثانیہ (سیکنڈ) ہو یا وہ لکھوکھا برس کا عرصہ ہو۔ اِن دونوں پر لفظ یوم حاوی ہو جاتا ہے۔ خود قرآن نے مختلف مقامات پر لفظ یوم کا استعمال ایسا ہی وسیع کیا ہے۔ اگر "یوم الدین" سے ہم یوم حشر مراد لیتے ہیں تو وہ بھی صحیح ہے۔ لیکن لفظ یوم سے ہر ایسا مرحلۂ زندگی بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ جب کسی کے اعمال کی جزا سزا اُس پر مرتب ہو جاتی ہے اگر قانون جزا سزا کی حقیقت پر غور کیا جائے تو اِسکا عمل تو ہر وقت ہو رہا ہے خواہ ہم محسوس کریں یا نہ کریں۔ ہمارا ہر قول و فعل ہماری حرکات و سکنات ہر آن میں جزا از جزا یا سزا کے نتائج سے خالی نہیں رہتیں قرآن کریم نے ایسا وسیع المفہوم لفظ استعمال کر کے ہمیں متنبہ کر دیا ہے کہ ہم اپنے اعمال کے نتائج کے لیئے کسی آنیوالے دن کے ہی منتظر نہ رہیں نہ اپنے اعمال بد کی سزا کو کسی دور کے دن پر جسے ہم نے علی العموم موت کے بعد سمجھ رکھا ہے ملتوی شدہ سمجھیں۔ وہ دن بھی آنیوالا ہے لیکن جزا و سزا اعمال کا معاملہ تو سریع الحساب بے لاتبدیل قانون کے ماتحت ایک دست بدست سودا ہے وہ تو "اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے" کے مصداق ہے۔ اس لیئے کسی فعل بد کی سزا کو یوم القیمۃ

تک ملتوی سمجھ کر بے فکر نہ ہو جاؤ جس آن تم نے کوئی عمل بد کیا۔ اُسکی پہلی سزا تو اُسی وقت تم پر مرتب ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس فعل بد کے دوبارہ کرنے کی تم میں جرأت ہو جاتی ہے۔ اور تمہارے اخلاق کی چادر پر ایک خفیف سا سیاہ دھبہ پڑ جاتا ہے جو دن بدن بڑھتا جاتا ہی۔

اِس صفت ربانی میں لفظ مٰلِکِ بھی بہت معنی خیز ہے گو معاملہ جزا سزا کو عدل سے بھی تعلق ہوتا ہے۔ لیکن ملہم قرآن نے اس امر میں لفظ عادل کی بجائے لفظِ مٰلِکِ استعمال کیا ہے۔ اول تو عدل ایک حاکم کو قوانین مجوزہ کے مطابق چلنے پر مجبور کر دیتا ہے وہ قانون کا غلام ہوتا ہے جو شان خداوندی کے منافی ہے۔ (واللہ غالب علیٰ امرہٖ) دوسری طرف انسان کے اعمال تو ربانی عدل کے نیچے اگر اُسے کسی کام کا نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ کونسا دن ہم پر گزرتا ہے جسمیں ہم سے بیسیوں غلط کاریاں سرزد نہیں ہوتیں۔ اگر خدائے تعالیٰ ہم سے عدل کا معاملہ کرے تو ہمارے تو ایک دن کے اعمال بد ہماری تباہی کے لیئے کافی ہیں ؀

یہ تو اُس کا احسان ہے کہ رب العالمین ہمارے معاملات میں اپنے قانونِ جزا سزا کو عادلانہ رنگ میں نہیں برتتا بلکہ ہمارا اسکا تعلق مالک و مملوک کا ہے اگر تو ہمارے اعمال صحیح راہ اختیار کریں اور کسی امر کے حصول میں ربانی قوانین کا لحاظ کر لیں تو ہمارے ایسے عمل کے معاوضہ میں شان رحیمیت اپنی پوری طاقت کے ساتھ فیض رساں ہو جاتی ہے

ہمارے ہر فعل کا عوض دس گنا یا سو گنا نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے ہاں اگر کسی نتیجہ کے حصول میں ہم غلطی کر جائیں تو بھی وہ مالکِ حقیقی کچھ نہ کچھ عطا کر ہی دیتا ہے۔ رہیں ہماری غلط کاریاں، اُن کے متعلق بھی ہم سے مالکانہ سلوک ہی ہوتا ہے۔ سزا دینے میں بھی ایک مالک کے سامنے خیال ملکیت طبعًا آجاتا ہے۔ اگر عفو اور درگزر کا سلوک غلطی کی اصلاح کا موجب ہو جائے تو مالک درگزر ہی کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ لیکن اگر مملوک میں تمرد کا رنگ پیدا ہو جائے اور وہ صحیح راہ پر کسی تادیب کے سوا آ ہی نہ سکے تو مالک کی سزا ہماری اصلاح کے لیئے ہم پر تادیبًا وارد ہو جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر کسی امر صحیح کی جزا دیئے بغیر تو خدا نہیں رہتا۔ خواہ ہمارا اختیار کردہ طریق اپنے اندر کامل صحت نہ رکھتا ہو بالمقابل غلط کاریاں اول تو معاف ہو جاتی ہیں۔ اور جب معافی تمرد کو بڑھانے کا موجب ہو تو اصلاحًا سزا بھی آجاتی ہے۔ یہ نہیں کہ خدا عوض لیئے بغیر گناہ معاف ہی نہ کر سکے۔ اس نظریہ پر کائنات شاہد ہے۔ لیکن اس مسئلہ جزا و سزا کا غلط مفہوم مختلف اعتقادات کا موجب ہوا مسئلہ **کفارہ** یا **تناسخ** وغیرہ اسی مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس پر یہاں کچھ کہنا میرا تو مقصد نہیں۔ لیکن اگر عامہ صحیفہ قدرت پر نگاہ ڈالی جائے اور اسمیں قانونِ جزا سزا کا مطالعہ کیا جائے تو رب العالمین کی حکومت میں مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کا بھی رنگ نظر آتا ہے۔

کائنات کا خدا بھی لہذا ربّ العالمین۔ رحمٰن۔ رحیم اور مالکِ یوم الدین ہی نظر آتا ہے۔

اگر الہامِ قرآن ہمیں اس کائنات کے فرمانروا کے اندازِ حکومت سے اطلاع نہ دیتا تو آج سائنس نے جس پس پردہ ہستی کے ایسے قوانین کا پتہ چلایا ہے جو کل کائنات کی اشیاء کو ہم آہنگ کرکے ایک کو دوسرے کا رازق و مرزوق بنا رہے ہیں۔ اُسکے قوانین بھی تو گویا ربوبیت، رحمانیت۔ رحیمیت اور مالکیت کے ماتحت ہی نفاذ پائے ہوئے نظر آتے ہیں کائنات کے ہرطرف بے شمار اشیاء کے عالم نظر آتے ہیں۔ یہ سب ایک ہی قسم کی تنظیم و تقدیر کے ماتحت پیدا ہوتے، بڑھتے اور بلوغت تک پہنچتے نظر آتے ہیں سب کا رزق پہلے سے ہی موجود ہے۔ لیکن اسکا حصول ہر ایک کے لیے اُسکی سعی و کوشش سے ہی وابستہ ہے۔ ایک پتھر کے کیڑے کو بھی رزق کوشش کے بغیر نہیں ملتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کائنات میں ادنےٰ سے ادنےٰ کوشش بھی اگر صحیح طریق پر ہو تو بے انداز ثمرات پیدا کر دیتی ہے۔ ہر ایک چیز ایک نہ ایک قانون تلے کام کر رہی ہے۔ جبتک کوئی اُن قوانین کی مطابقت نہ کرے وہ کسی خیر و خوبی کو پا نہیں سکتا۔ بالمقابل ان مقررہ قوانین کی خلاف ورزی کے بدنتائج بعض وقت تو ظہور پذیر نہیں ہوتے۔ لیکن آخر کار قانون کائنات کی خلاف ورزی سزا و عذاب دیئے بغیر نہیں رہتی۔

ہر ایک شخص جیسے میں لکھ چکا ہوں کائنات کے متعلقہ حقائق علمیہ سے واقف نہیں ہوتا۔ لیکن جب مذہب کی اطاعت اس قسم کی دائرہ وسائرہ ہے تو مذہب کا بھی فرض ہے کہ وہ حاکم ازلی کے کارکن اخلاق سے ہمیں اطلاع

دیدے۔ اب اگر رب کائنات حسب تشریح بالا رحمٰن، رحیم اور مالک واقع ہوا ہے
تو میں اُس مذہب کی جتنی بھی تعریف کروں تھوڑی ہے کہ جس نے نماز میں ہی
ایک دعا کنندہ کے آگے خدا کے اُن خط و خال کو پیش کر دیا کہ جنکے خلاف
نہ اُس خدا نے خود جانا پسند کیا ہے اور جن کی متابعت میں ہی وہ کسی مانگنے
والے کی التجا کو قبول کرتا ہے۔ اگر ایک نماز پڑھنے والا اپنے عقیدے کے
مطابق خدا کی جناب میں اپنی ضروریات پیش کرنے یا حل مشکلات کیلئے
عرض کرنیکا بہترین موقع نماز ہی کو سمجھتا ہے تو پھر سورۂ فاتحہ اُسے نوٹس دیتی
ہے کہ اسکی دعائیں اور اسکی گریہ و زاری سب بیکار ہے۔ اگر اُس نے حل مشکلات
کے لیئے اسباب ضروریہ سے اور وہ اسباب رحمانیت نے پیدا کر رکھے ہیں حتی
الامکان تمسک نہیں کیا۔ وہ عالم الغیب ہستی ہماری استعداد سے خوب
واقف ہے یہ ممکن ہے کہ ایک کا علم اور اسکی عقل جن اسباب پر اُسے حاوی کرتی
ہے دوسرے کی پہنچ وہاں تک نہیں۔ لیکن علیم و بصیر خدا نے بھی انسان کو
اُسکی وسعت کے مطابق ہی مکلف کیا ہے (لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا)
ہمارا فرض ہے کہ حصول مدعا میں ہماری کوششیں اگر زیادہ نہیں تو ہماری وسعت
تک خدا کے علم میں آجائیں۔ اور ہم حتی الوسع اسباب رحمانیت کو استعمال میں
لے آئیں۔ اُس صورت میں یقیناً ہمارا چرب انداز ہوگا لیکن جو کسی مقصد
کی طلب میں خدا کی دی ہوئی طاقت اور خدا کے پیدا کردہ اسباب سے فائدہ ہی
نہیں اٹھاتا نہ معلوم وہ اپنی دعا میں کس خدا کو پکار رہا ہے۔ اُس نے اُس خدا
کو نہیں پکارا جنکے اسمائے پاک اُسکی زبان پر جاری ہیں۔ اُس نے آغاز

نماز میں بالضرور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ کے الفاظ دُہرائے ہیں لیکن اُس نے رب اور رحمٰن کی عملاً حمد نہیں کی۔

میں نے ابتدا میں لفظ حمد کی تشریح کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ حمد اُس تہ دل سے شکر گزاری کا نام ہے جو خدا کی پہلے سے دی ہوئی نعمتوں کے متعلق ہو۔ گویا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہکر ہم نے اعتراف کر لیا کہ ہماری نفع ضرورت کے جو بھی اسباب ہیں وہ پہلے سے ہی موجود ہیں۔ انکی شکر گزاری تو انکے استعمال سے [illegible] پھر جو خدا کی دی ہوئی چیزوں کو استعمال نہیں کرتا وہ تو کافر نعمت ہو۔ لہذا ایسے کی دعا کیسے سُنی جائے خود خدا نے جس سے ہم دعا ئیں مانگتے ہیں۔ اس نے یہی دعا کے متعلق دو اور قوانین سے ہمیں اطلاع دی ہے جن میں سے پہلے قانون کو اس نے "وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ" (کافر کی دعا ضائع ہی جاتی ہے) کے الفاظ میں ظاہر کر دیا۔ یعنی جس نے خدا کی نعمتوں کو استعمال نہیں کیا اسکی دعا سنی نہیں جاتی۔ اسکا دوسرا قانون ایک عظیم الشان مژدہ اُس مومن کے لیے ہے جو خدا کی نعمتوں کو استعمال کرکے پھر دعا مانگتا ہے وہ مژدہ دراصل قانون رحیمیت کی تفسیر ہے اور وہ یہ ہے:

لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ

(اگر تم شکر گزار ہوگے تو ہم تم پر اور بڑھائینگے)

خدا کے قوانین سے وہ قوانین مراد ہیں جو العام نے تعلیم کیے یا سائنس نے دریافت کیے۔ کوئی کافر ہو تمہارا عقیدہ کچھ بھی ہو دیکھو کہ ایک [illegible] سے ثمرات شروع ہوتے

ہیں یا نہیں۔

یہ باتیں کوئی خیالی نظریہ نہیں۔آج دنیا کا تجربہ دیکھ لو۔اقتصادیات میں مغرب مشرق سے بڑھ گیا۔اور مشرق میں غیر مسلم مسلموں سے گوئے سبقت لے گئے عام اس سے کہ کسیکا کوئی عقیدہ ہو واقعات یہی ہیں۔آخر اسکا کیا سبب ہے۔میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ فیض ربوبیت و رحمانیت کی تقسیم میں عقیدے کو کوئی دخل نہیں۔اور رحیمیت کا فضل بلا تنقید و تنظیم ایمانیات اقتصادی و معاشی اور معاشری معاملات میں اُسکے شامل حال ہوگی جس نے ان معاملات میں رحمانیت سے استفادہ کیا۔اگر میں اس نظریہ میں غلطی پر ہوں تو علمائے کرام مجھے معاف فرمائیں آخر میں ایک انسان ہوں اور غلطی کرسکتا ہوں اور میرے خیالات ہر وقت محتاج اصلاح ہیں۔لیکن خدارا مجھے تبلاؤ کہ اقتصاد و معاشیات میں اور انہیں کی بہتری میں سیاسیات کی بہتری نتیجۃً پیدا ہوتی ہے وہ رب العالمین۔رحمٰن۔رحیم۔اللہ کیوں مسلمانوں سے منہ موڑ چکا ہے کیوں اُسکی رحمت کی موسلادھار بارش مغرب پر ہی برس رہی ہے۔اور اگر اس بارش کی کچھ چھینٹیں مشرق میں بھی آپڑتی ہیں تو انہیں زمینوں پر جو غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہیں۔فَاعْتَبِرُوْا یَآ اُولِی الْاَبْصَارِ مجھے تو اس سوال کا جواب یہی نظر آتا ہے کہ جس نے رحمانیت اور رحیمیت کی رمز کو سمجھا خواہ یہ رموز الٰہی اُسپر الہام کے ذریعہ یا سائنس کے ذریعہ آشکارا ہوئیں وہ ہی اس دنیا میں سرسبز ہوگا۔اسمیں شک نہیں کہ صحیح عقیدے ہی صحیح نتائج پیدا کرتے ہیں لیکن وہی عقیدہ مثمر ہوتا ہے جو عمل میں آجائے۔

ظہورِ اسلام پر کُل کی کُل دنیا حالت جمود میں تھی اور تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ قرآن حکیم نے آکر ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس نے انسان کی اقتصادی معاشی اور معاشری ترقی کو کمال تک پہنچا دیا۔ آخر یہ کیوں ہوا۔ قرآن جو لایا وہ تو آج بھی موجود ہے۔ قرونِ اولیٰ کے قرآن خوانوں نے رب العالمین کے موردِ انعام ہونے کی راہوں کو سمجھ لیا۔ اُن پر صفتِ رحمٰن نے ظاہر کر دیا کہ جو بھی وہ چاہیں اُسکے اسباب کائنات میں موجود ہیں اور اُنکی خواہشات پوری ہو سکتی ہیں اگر اُن اسباب سے تمسک کر لیں۔ اور ہر نماز میں اُنکے سامنے یہ نقشہ آجاتا تھا۔ انہیں قرآن نے کھول کھول کر بتا دیا کہ اُنکا نفع و نقصان اُنہیں کے ہاتھ کی کمائی ہے (لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ) وہ یہ بھی سمجھ چکے کہ رب العالمین کی حمد اور اُسکا شکر اُسکی دی ہوئی نعمتوں کے صحیح استعمال سے وابستہ ہے اور انہیں یہ مژدہ بھی پہنچ چکا کہ اس قسم کی عملی شکر گزاری ایک کام کے بیشمار ثمرات مرتب کرتی ہے۔ اِن ایمانیات کو سامنے رکھکر وہ جہد للبقاء کے پیچیدہ مسئلے کے حل کرنے میں لگ گئے اور انہوں نے اس لاینحل عقدے کو اس طرح کھولا کہ جو آج کامیاب ہے۔ وہ انہیں کے نقشِ قدم پر چل کر کامیاب ہے۔ ہم نے اُنکے کارناموں پر تو فخر کیا۔ لیکن ہم اُنکے قدموں پر نہ چلے۔ پھر جو بھی ہمارا حال ہو وہ ہماری ہی غفلت کا نتیجہ ہے۔

ہم اِسوقت خدا کے فیضِ رحمانیت اور رحیمیت سے تو محروم ہو چکے ہیں ہاں اُسکے قوانین مالکیت ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ اور ان کا بھی وہ حصہ جسے تعذیب و تادیب سے تعلق ہے۔ جو کچھ بھی آج ہمیں تھوڑا بہت حاصل ہے وہ مالکیت کے اِس فعل سے ہے کہ انسان کی ٹوٹی پھوٹی کوششیں بھی کچھ نہ کچھ پا لیتی ہیں

ورنہ جو مصیبت فلاکت اور ذلت ہمیں ہر طرف کھا رہی ہے وہ اسلیئے ہے کہ اس عذاب کے ذریعہ ہماری آنکھ کھلے۔ ہم رحمانیت اور رحیمیت کی شان کو سمجھ جائیں۔ ورنہ اگر ہم اپنی غفلتوں ہی میں پڑے رہے جیسے آج ہم ہیں اور ہمارے ذنوب ہمارے عمل نیک سے بڑھ گئے تو پھر اُس رب العالمین کی نگاہ میں ہماری ہستی کا موجودہ پیراہن پہننے کے قابل نہ رہیگا۔ رب قرآن اسکو اپنے ہاتھ سے ہی پھاڑ ڈالیگا۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا ۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا ۝

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

پھر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ ہماری دعا ان الفاظِ بالا سے شروع کیوں ہوئی آیا وہ قدوس ہستی اس بات پر کان دھرے ہوئے ہے کہ کب ایک مسلمان اُسے کہتا ہے کہ اے رب تو نے بڑی بڑی دنیائیں اور عالم پیدا کر رکھے ہیں اور انہیں تو پرورش کر رہا ہے ایسا قیاس تو اُس غنی اور حمید کی شان کے منافی ہے۔ وہ صمد تو کل انسانی ستائشوں سے بے نیاز ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اُس ذات پاک کو ایسا ہی ظاہر کیا ہے یہ سچ ہے کہ ان مختلف عالموں کا وجود ہماری زیست کیلئے ضروری تھا تو کیا اُس خدا نے ہمیں اُسے مخاطب کرنا اسلیئے سکھلایا کہ وہ ہم سے ان انعامات کا اعتراف بزنگ شکریہ کرانا چاہتا ہے۔ اس قسم کے شکریہ کا اُسے کیا فائدہ اور ہمیں کیا فائدہ۔ ایک عالی ظرف انسان بھی پسند نہیں کرتا کہ اسکا کوئی مرہون احسان اسکی عنایات کے شکریہ میں اُسکے سامنے کوئی لفظ کہے تو کیا رب العزت ہی ہم سے اس امر کا متمنی ہے۔ میرے نزدیک تو اس قسم کا وہم کرنا بھی گناہ ہے۔ ہاں اگر انعامات الٰہیہ کا شکریہ خالصتہً ان سے

استفادہ کرنے پر مبنی ہے تب تو یہ بات ایک بڑی حقیقت ہوجاتی ہے گویا ایک مسلم کو اسکی نماز سب سے اوّل یہ یاد دلاتی ہے کہ زمین و آسمان میں جسقدر عالمین ہیں وہ تیرے ہی فائدے کیلئے ہیں اور انمیں ایک بھی چیز نہیں جو اغراض انسانی کے لحاظ سے بیکار ہو۔ اور انسان کا فرض ہے کہ وہ ان عالمین کو اپنے لیے مفید بنائے وہ موجودات کائنات کی تخلیق و تقدیر پر غور کرکے ان راہوں کو دریافت کرے کہ جس سے یہ سب کی سب چیزیں اسکے لیئے نفع رساں ہوجائیں۔ جب قرآن نے جہاں ہماری ہر دعا کو اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کیساتھ شروع کرنا سکھلایا وہاں ایک اور جگہ قرآن نے ہمیں یہ بھی تبلایا کہ تم میں وہی صاحب دانش و بینش ہے اور وہی خدا کی حقیقی حمد کرتا ہے جو زمین و آسمان کی چیزوں پر اس غرض سے غور و فکر کرتا رہتا ہے کہ ان چیزوں میں کوئی نہ کوئی اسکا فائدہ ہے۔ آخر کار وہ اس فائدہ کو پالیتا ہے اور اسکے اعمال و افعال زبانِ حال سے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (ہمارے رب! تونے کوئی بھی ایسی چیز نہیں بنائی جو ہمارے مصرف کی نہ ہو) کہتے ہیں اس موقع پر قرآن حکیم نے تنبیہًا ہمیں یہ بھی اطلاع دیدی کہ جو انسان ان سماوی ارضی اشیاء کے متعلق عملاً اس نتیجے پر آنے کی کوشش نہیں کرتا وہ نارِ ذلت میں ڈالا جاتا ہے۔ اس نے اپنے نفس پر خود ظلم کیا اور ایسے ظالم کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ یہ عبرت بخش احکام

لہ اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَا اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ترجمہ:۔ جو اللہ کو کھڑے اور بیٹھے

(بقیہ بر صفحہ ۵۷)

قرونِ اولیٰ میں تو ایک طرح اور ہمارے زمانہ میں دوسری طرح پورے ہو گئے ہمارے اسلاف نے تو ارشادِ دینی پر عمل کیا۔ انہوں نے سماوی ارضی اشیاء کو بیکار و باطل نہ سمجھا۔ وہ اپنے تفکر فی خلق السمٰوٰت والارض سے صاحبِ فتوحات ہو گئے ہم نے اس تفکر سے مُنہ موڑا اور آج ہم ذلیل و خوار ہو گئے۔ یورپ اگر آج صاحبِ عزت واقتدار ہے تو اسی تفکر اور اسکے نتائج کی طفیل ہم اگر آتش خزی و ذلت میں پڑکر بے یار و مددگار ہو گئے ہیں تو اسی عدمِ تفکر کے باعث۔

جو مُسلم قومیں اسوقت ادبار سے نکلنے کے فکر میں لگ گئی ہیں وہ ایرانی ہوں یا افغانی۔ وہ ترک ہوں یا عرب۔ انہیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ استقلالِ قومی اسی وقت پائدار و مفید ہو گا۔ جب وہ اپنی اپنی زمینوں میں شیونِ رحمانیت و رحیمیت سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے۔ وہ اپنی قوم میں قوتِ عمل کو پیدا کر کے اپنی ہی مملکتوں کے مدفون خزائن کو استعمال میں لائیں۔ ان خزائن سے میری مراد کوئی سونے چاندی کے دفینے نہیں وہ کون سی چیز ہے جسمیں سونے اور چاندی کی قیمت کے جوہر نہیں۔ آخر لوہا بھی تو سونے چاندی سے زیادہ قیمت پاتا ہے جب اُس سے جیبی گھڑی کے بعض پرزے بنتے ہیں۔ انگلستان جیسے چھوٹے جزیرے کے علم و عقل نے وہاں کے کوئلے اور لوہے میں وہ طاقت بخشی کہ آج انگریزوں کا

(بقیہ نوٹ صفحہ ۵۶) اور اپنی کروٹوں پر یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں فکر کرتے رہتے ہیں ہمارے رب تو نے اسے بیفائدہ پیدا نہیں کیا۔ تو پاک ہے بس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔ ہمارے رب جسکو تو آگ میں داخل کرے۔ یقیناً تو نے اُسے رسوا کیا اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ۱۲ (آل عمران آیت ۱۹۰)

لوہا کل دنیا مانتی ہے۔

لیکن خدا کے دیئے ہوئے کل خزائن کے مقابل سب سے بڑھکر وہ خزانہ ہے جو رحمٰن نے ہر انسان کو بخش رکھا ہے وہ اسکی قوتیں اور اسکے حواس ہیں۔ اور ان میں سے جن تین نعمتوں اور اُنکے صحیح استعمال کیطرف قرآنِ کریم نے خاص طور پر اپنے پڑھنے والے کو متوجہ کیا ہے۔ وہ انسان کی آنکھ اُسکے کان اور اُسکا دل ہے جو ان تین چیزوں کا صحیح استعمال نہیں جانتا وہ بالفاظِ قرآن اُس چارپائے کی طرح ہے[لہ] جس کا سر اور آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ اور وہ اپنے لیئے سیدھی راہ نہیں دیکھ سکتا۔ لازماً اُسکی رسی دوسرے کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ اُس کا محکوم ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ علم ہی ایک چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے علم کے بغیر انسان حیوان ہے۔ یوں تو ہمارے حواس خمسہ کل کے کل ہمارے علم کا ذریعہ ہیں لیکن ان سب کی سرتاج ہماری قوتِ سماعت و بصارت ہے کان اور آنکھ کے ذریعہ جو باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں اُنپر صحیح محاکمہ کرنا اور اُس محاکمہ کے بعد ان معاملات کو اپنے خزانہ علم میں داخل کرکے اُس علم پر عمل کرنا ایک قلب سلیم کا کام ہے۔ الغرض یہ تین قوتیں ہی وہ بخشش الٰہی ہیں جو اپنی قدر و قیمت میں کل خزائن کائنات سے بڑھ گئی ہیں۔ اور ان سب پر حکمراں انسان کا دل ہے۔ جس نے اپنے دل کو روشن کرلیا وہ دنیا کا مالک ہوگیا اور

[لہ] تو کیا جو اپنے مُنہ پر اوندھا چلے ہدایت پر ہے یا وہ جو صحیح سالم سیدھے رستے پر چلے۔ کہہ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیئے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔ کیا ہی کم تم شکر کرتے ہو ۱۲

یہی عطیہ الٰہی کا حقیقی شکریہ ہے جس پر قرآن کے الفاظ[۵۱] خود شاہد ہیں۔ جس قوم نے نورِ علم سے دل و دماغ کو منور کر لیا اور اُس نور کی روشنی میں آنکھ اور کان سے صحیح کام لیا اُس پر زمین و آسمان کے خزانے کھل جاتے ہیں وہی رب العالمین کا حقیقی پرستار اور سچی حمد کرنے والا ہوتا ہے اور اُسکی نماز حقیقی نماز ہوتی ہے۔

یورپ کی رسموں کی پیروی یا اُنکے سوشل امور کی متابعت سے تو بنفسہٖ کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اگر اسی طرح اپنے قلب اور چشم و گوش کو امور معاشی میں صحیح طور پر استعمال کرنا سیکھو تو اسلامی ممالک میں وہ خزائن ہیں کہ جن کے مقابل مغرب کی دولت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ لیکن ان قوائے ثلاثہ کی تربیت و تہذیب صرف مردوں سے ہی تعلق نہیں رکھتی۔ اگر آنکھ کان اور دل اللہ تعالیٰ نے خواتین کو بھی بخشے ہیں تو کیوں ہماری بیبیاں اُنکی تہذیب و تربیت سے محروم رکھی جائیں۔ اگر مغرب کو آج مشرق پر فوقیت ہے تو اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہاں کی بیبیاں بھی زیورِ علم سے خالی نہیں اور وہ اقتصادی جد و جہد میں مردوں کی دست راست بن رہی ہیں۔

اس موقع پر مجھے اپنے افغانی بھائیوں کو بھی کچھ کہنا ہے۔ وہ تو وہ کون مسلم ہے جو وہاں کے فرماں روا کی کوششوں کو نظرِ استحسان سے نہ دیکھے۔ خدا انہیں اپنے مقاصد میں کامیاب کرے لیکن اُن کی خدمت میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تہذیب نسواں یورپین رسوم اور مغربی معاشرت[۵۲] سے چنداں وابستہ نہیں۔ خواتین افغانستان اگر حسب فرمودۂ خداوند اپنے قلب و چشم و گوش کو بصیرت سے استعمال کرنا سیکھ جائیں اور وہاں کے

[۵۱] دیکھو نوٹ صفحہ ۵۲ +

مرد بھی رب العالمین کے سچے عابدین ہو جائیں یعنی وہ اُن خزائن کو استعمال میں لانا سیکھ لیں جو افغانستان کے صرف عالم معدنیات و عالم نباتات میں اور دیگر گوشہ ہائے زمین افاغنیہ میں مدفون ہیں ایسا ہی افغانی دل و دماغ خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بالفعل کرلے، وہ رسمی اور اسمی مذہبی باتوں سے نکلکر قرآن کے سچے پرستار ہو جائیں۔ اُن کی نماز پانچوں وقت اُنھیں اُن امور کی طرف ہدایت کرے جس کی کچھ تشریح میں نے اِن اوراق میں کی ہے تو وہ سب کچھ پالیں گے جس کا مستحق ایک مسلم کو رب العالمین نے پیدائشی کیا ہے۔ یہاں جو کچھ میں نے افغانوں کے متعلق کہا ہے۔ اِنکے مخاطب بالفاظہ ترکی۔ ایرانی اور دیگر مسلم برادران بھی ہیں اور ان میں ہندی مسلم بھی شامل ہیں۔

یہ سیاسی صلاحیں جن کی فکر میں یہاں آج ہندو مسلمان لگے ہوئے ہیں اور انہیں ہر ایک قوم اپنے اپنے فائدے کو پیش نظر رکھ رہی ہے اسکے متعلق میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مسلمانوں کا فائدہ، نقصان بالآخر قلیت و اکثریت پر منحصر نہیں نہ خاص نشستی رعایتوں سے کوئی فائدہ ہوگا۔ جب تک مسلمان اپنی علمی۔ اقتصادی۔ اخلاقی اور مالی حالت کو درست نہ کرینگے اُنکی اکثریت جہاں جہاں انھیں یہ اکثریت حاصل ہی اور کوئی رعایت خاصہ جہاں وہ اقلیت میں ہیں اُنھیں نفع رساں نہ ہوگی۔ اقلیت کوئی چیز نہیں، جب مٹھی بھر انگریز تینتیس ۳۳ کروڑ نفوس پر حکمران ہیں تو پھر اُنکی طرح وہ قوم جو خواہ کتنی ہی اقلیت میں ہو اگر روشن دل رکھتی ہے

اور اہل بصیرت ہی وہ نا تربیت یافتہ دل و دماغ والوں پر حکمراں ہوگی
جو دل و دماغ والے ہونگے وہ حیوان بشکل انسان کے گلے میں رسی ڈالکر
جہاں چاہیں گے اُسے کشاں کشاں لیے جائینگے ۔ اور اگر انکو اکثریت
بھی حاصل ہے تو اقلیت والے کندۂ ناتراشوں کا خدا حافظ ہے۔ یہ فتوےٰ
خداوندی ہے۔ اور اسکا شاہد جیسے کہ آیت مندرجہ صفحہ (۵۹) بتلاتی ہے
آسمانی بادشاہت کا وہ چارٹر ہے جسکا نام قرآن ہے۔ اور اس فتوے
کے نفاذ میں کسی رسمی اسمی مسلمان کی پروا نہ کی جائے گی۔ خدا کے ہاں
مومن کی ہی عزت ہے اور مومن وہ ہے جو صاحب عمل ہو۔

فیض رحمانیت اور رحیمیت سے پورے طور پر مستفید ہونے کا طریق

یہ میں لکھ چکا ہوں کہ ہماری اقتصادی و معاشی بہبودی کے لیے اگر
فیض رحمانیت نے کائنات میں مواد کے خزانے جمع کر رکھے
ہیں تو اس مواد کو عمل انسان پر رحیمیت و مالکیت حسب حالات باثمر
کر دیتی ہے۔ ہاں اس مواد کے کامل مثمر ہونے کے طریق بھی وہ ہی
ہیں جو رب العالمین نے نظام کائنات میں خود اپنے لیے وضع کر رکھے
ہیں۔

یہ واضح ہو چکا ہے کہ رب العالمین ایک مقنن۔ مدبر۔ منتظم ہستی ہے
اس کے ہاں تخلیق و تربیت کے قوانین مقرر ہیں۔ ہر چیز کی پیدائش
[illegible] کا و [illegible] تجویز شدہ ہے جس سے انحراف نہیں ہوتا

جو کچھ ہوتا ہے قاعدے اور ضابطے سے ہوتا ہے۔ پھر اس سے بڑھکر یہ بات ہے کہ پیدائش اشیاء سے پہلے انکی شکل۔ مقدارِ مواد منازلِ ترقی۔ اور ہر منزل پر اسباب تربیت یہ سب کا سب پہلے ہی سے تجویز و تدبیر و تہیہ میں آجاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا جیسے کہ ایک دہریت پرست خیال کرتا ہے کہ ذراتِ عالم کوئی شکل اختیار کرکے فضا میں بے لگام پھرتے رہتے ہیں۔ اور خود بخود اپنے اپنے ماحول کے ماتحت کوئی نہ کوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ گو رب العالمین ایک قادرِ مطلق ہستی ہے لیکن اُسکے نظام میں یہ ہی نظر آتا ہے کہ اُنکی ربوبیت اور اُسکا ہر مرحلہ ایک پیش از وقت غور کردہ تدبیر۔ تجویز۔ تنظیم۔ تقدیر (تقررِ مقدار مواد) اور تہیہ کے ماتحت کام کرتا ہے۔

جب ایک قادرِ مطلق ہستی نے اپنے کاموں کو اس طرح سرانجام دیا ہے تو پھر ہم ان راہوں کے اختیار کرنے کے بغیر کب کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھکر ہمارے ہر کام کی ناکامی اور بعض غیر مسلم قوموں کی کامیابی کے وجوہ آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں ہم ہر کام میں ناکام ہیں۔ اور دوسروں کا قدم کامیابی ہر روز آگے ہی آگے ہے۔ وہ کونسا کام ہے جسکے شروع کرنے سے پہلے ہم سوچ بچار کر لیتے ہیں۔

کامیاب قوموں کو دیکھ لو وہ برسوں تدبیر تجویز میں لگا دیتی ہیں تجویز کردہ کام کے کل اسالیب پر کامل غور کرتی ہیں۔ اس کام کے ماہرین کچھ

اپنے مشورے میں لاتی ہیں۔ اُنکے مشورے کے مطابق کل سامان مہیا کرتی ہیں پھر جب کام شروع کرتی ہیں تو وہ مشین کی طرح چلکر تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ وہ رنگ ہی جو کائنات کی ہر ایک چیز میں ہی۔ ہر ایک چیز ابتدا سے انتہا تک مشین کی طرح منازل ارتقا طے کر رہی ہے جس طرح تم ایک مشین کو کنجی دے کر کام کے قابل کر دیتے ہو۔ اسی طرح کائنات کی ہر ایک چیز کو کنجی لگی ہوئی ہے۔ اسی طرح متمدن قوم اپنے مہتم بالشان کاموں کو شروع میں ہی ایک قسم کی کنجی لگا دیتی ہیں۔ بالمقابل مسلمانوں کے کاروبار دیکھ لو نہ وہاں تنظیم و تنسیق نظر آتی ہے نہ کوئی تجویز و تدبیر ہے۔ نہ کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے کسی ماہر کامل سے مشورہ لیا جاتا ہے نہ اُن راہوں یا ضوابط کا احصار کیا جاتا ہے جو اُس کام کی کامیابی کی صراط مستقیم ہو۔ نہ اِس مواد کے پیش از وقت مہیا کرنے کی صورت پیدا کی جاتی ہے جو اسکے لیئے ضروری ہے۔ ہمارے انداز تو یہ ہیں کہ جو کام تخیل و تصور میں آیا جھٹ اُسے شروع کر دیا۔ اور جس وقت یا جس مرحلے پر ہماری عدم تدبیر کے باعث کوئی تباہ کن صورت پیدا ہو گئی اُس وقت مشورے کی فکر میں ہوئے۔ اور کسی ماہر کی تلاش کی جو ہمیں کار درست کی کامیابی تبلائے۔ اس وقت السعی منی والاتمام من اللہ کا فقرہ ہماری زبان پر آتا ہے۔ اور ہم متوکل بن جاتے ہیں تباہی منٹ بہ منٹ ہماری طرف آ رہی ہے لیکن ہم کبوتر وار اُس گربۂ مصیبت کے سامنے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ آخر ہمارا حال وہی ہوتا ہے جو اجل زدہ کبوتر کا ہوتا ہے۔ ایک منٹ کے لیئے ہم نہیں سوچتے کہ جب

العالمین نے قادر مطلق ہونے پر بھی اپنے کاروبار میں تدبیر اور تہیّہ کو پسند کیا ہے تو ہم کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ ہم اگر زمین پر اُسکے نائب یعنی

خلیفۃ اللہ علی الارض

ہیں تو پھر حقیقی نیابت تو اسیں ہے جو مناب کے قدم بقدم چلے کیا ان امور میں رب العالمین کے نائب مغربی لوگ ہیں یا ہم؟ اور اس ملک میں اس کے قائم ہندو ہیں یا مسلمان؟ پھر کیوں ہمیں اپنی شومیٔ بخت پر اپنے کاروبار کی ناکامی۔ اپنے کارخانوں۔ تجارتوں۔ پیشوں اور اپنی حرفتوں کی بے رونقی پر کوئی گلہ ہو۔

رحمانیّت رحیمیّت

ایک مسلم کو حکم ہے کہ جو کام بھی شروع کرے۔ اُسکے آغاز میں "بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ" کہے تو وہ کام بابرکت ہوگا۔ یہ ایک صداقت حقہ ہے۔ لیکن انسان تو حیوان نہیں وہ ابتدائے کام میں کیوں طوطا بن جاتا ہے! الفاظ دُہرانا تو طوطے کا کام ہے۔ خدا نے انسان کو فہم و فراست بخشی ہے وہ جو مُنہ سے کہے اُسکے اعمال اُسکی تصدیق کریں۔

بسم اللہ شریف تو ایک بشارت عظمٰے تھی ہماری جدوجہد کی محرک دو چیزیں ہوتی ہیں۔ جب تک ان دو چیزوں کے وجود پر ہمیں کامل یقین نہ ہو۔ ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ اُس چیز کا مواد اور مصالحہ موجود ہونا چاہیے جسے ہم نے کام میں لانا ہے۔ دوسرا ہمیں اس بات کا بھی

یقین ہونا چاہیئے کہ ہماری محنت ضائع نہ جائے گی۔ اگر ہمیں یہ یقین ہو جائے کہ ہماری محنت کئی گنا نتائج پیدا کرے گی تو پھر ہماری قوت عمل رات دن کو نہ دیکھے گی۔ ہمیں کسی کام کے شروع کرنے سے پہلے جو بسم اللہ شریف پڑھائی گئی تو اس یقین کو ہمارے دل میں پیدا کرنیکے لیئے پڑھائی گئی۔ رحمٰن خدا تو ہمیں یقین دلاتا ہے کہ جو بھی تم چاہو اُسکے پیدا کرنیکے اسباب کائنات میں موجود ہیں۔ تمہارے ہاتھ ہلانے کی دیر ہے۔ رحیم خدا تمہارے ایک فعل پر متنوع نتائج مرتب کرتا ہے۔

الہام الٰہی اگر اس لیئے بھی آیا ہے کہ ہمیں نعمائے ربی کے وارث ہونے کے قابل کر دے تو جس کتاب الٰہی نے ہمیں خدا کی صفاتِ رحمٰن و رحیم سے اطلاع بخشی۔ اِس سے بڑھکر کسی اور مقبولہ کتاب الٰہی نے نسل انسانی پر اسقدر احسان نہیں کیا۔ میدانِ سائنس میں جس قدر سرگرمیاں ہو رہی ہیں اور جو جو علمی انکشافات ہوئے ہیں اُن سب کا محور یہ ہی ایک یقین ہے کہ جس غرض کی جست و جو میں ہم لگ جائیں اُسکے اسبابِ حصول پہلے سے موجود ہیں۔ اور ہماری سرگرمی اور ہمارا کوئی عمل بھی ضائع نہ ہوگا بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ رحمان و رحیم ہے۔ اِس حقیقت کو قرآن حکیم نے مختلف پیرایوں میں مبرہن کیا۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کیئے

؎ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيتَاءِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ (النحل آیت ۹۰) **ترجمہ** اللہ تمہیں عدل اور احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور زیادتی سے روکتا ہے الخ ۱۲

آسمان سے پانی اُتار کر اُس کے ذریعے زمین سے تمہارے رزق کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر دیں۔ جہاز رانی کے لیئے سمندر تمہارے ماتحت کر دیئے ایسے ہی دریاؤں کو بھی تمہارے مسخر کر دیا۔ چاند و سورج کی حرکتیں اور دن رات کا پیدا ہونا بھی تمہاری خدمت کے لیئے ہے۔ الغرض جو چیز بھی تم مانگو وہ ہم نے تمہیں دے رکھی ہے۔ نعمائے الٰہی تو اسقدر فراواں ہیں کہ تم شمار بھی نہیں کر سکتے لیکن انسان ہی اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور ناشکر گزار ہے[۱]۔

جن آیاتِ مندرجہ حاشیہ کا مفہوم الفاظِ بالا میں دیا گیا ہے اُن میں آخری آیت نہایت ہی معنی خیز ہے اور جو کچھ بھی رحمٰن و رحیم کی تشریح میں یہاں لکھا گیا اُسکی تائید یہ الفاظِ مقدس کرتے ہیں فرمایا جو چیز بھی تم مانگو تمہیں دے رکھی ہے (اٰتٰکم)..... لیکن انسان ہی اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے۔ اور وہ جاہل ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جس شکل میں ہم نے آخری مرحلے پر کسی چیز کو استعمال کرنا ہے۔ اُس شکل میں تو وہ چیز موجود نہیں ہوتی۔ ہاں اُس چیز کو مطلوبہ شکل میں پیدا کرنے کے اسباب موجود ہوتے ہیں پھر خدا نے جو یہ فرمایا کہ ہم نے وہ چیز دے رکھی ہے اور خاتمے پر ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ اس معاملے میں انسان خود ہی ظالم و جاہل ہے تو اس سے صاف مراد یہ ہے کہ موجوداتِ کائنات کو مطلوبہ صورت میں متشکل کرنے سے جو چیز مانع ہو جاتی ہے وہ ہمارا جہل اور لاعلمی ہے۔ خود لفظ ظلم بھی جہل کا مترادف ہے۔ اس میں صاف اشارہ ہے کہ تم علوم کو حاصل کر لو اور علم کی روشنی میں ہر ایسی چیز کو پیدا کر لو جس کی تمہیں طلب ہو

(۱) سورہ ابراہیم ۵ ع ۵ ۔

اُسکے اسباب پہلے سے ہی پیدا ہو چکے ہیں۔ ان اسباب کو استعمال کرنیکی یا اشیائے کائنات کے خواص سمجھنے کی استعداد بھی تم میں موجود ہے تم اپنی بالقوۃ استعداد کو بالفعل کرلو۔ اپنی علمی اور عملی قوتوں کو نمایاں کرکے پھر اُنکے ذریعہ زمین و آسمان کی چیزوں کو اپنے تفکر و تدبر میں لے آؤ اور مُنہ مانگی چیز پالو۔ میرا تو ان معاملات میں بروئے آیات مندرجہ حاشیہ صفحہ ۶۵ یہانتک ایمان ہے کہ ہمارے تخیل اور تصور میں بھی جو چیز از قسم آسائش آجائے وہ پیدا ہو سکتی ہے۔ ہاں علوم ضروریہ (سائنس) کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے فیضِ رحمانیت کی تشریح میں جہاں جہاں بھی نعمائے موجودہ کائنات زمین و آسمان کا ذکر کیا وہاں کہیں تو ان نعماء سے فائدہ اُٹھانے والوں کا نام اولی الالباب (صاحب دانش و بنیش) رکھا۔ کہیں اِس جماعت کو یبصرون۔ یسمعون۔ یعلمون یعقلون۔ یتفقھون۔ یتفکرون۔ یتدبّرون وغیرہ کی صفات سے متصف کیا۔ یعنی یہ وہ جماعت ہے جو کائنات کی اشیاء کو یا تو خود نظر بصیرت سے دیکھتی ہے یا اصحاب بصیرت کی باتوں کو گوش ہوش سے سنتی ہے۔ اُن کے متعلق علم ضروری حاصل کرکے اپنی عقل کو کام میں لاتی ہے اور ان باتوں پر تفکر و تدبر کرتی ہے۔ فی الجملہ وہ علمی اکتشافات اور حصول سائنس میں لگ جاتے ہیں۔ لفظ سائنس کوئی گھبرانے والی چیز نہیں۔ اسکے معنی علم و حکمت کے ہیں۔ خدا کا نام خود علیم و حکیم ہے اپنی کتاب مقدس کا نام بھی اُس نے حکیم رکھا ہے۔ پھر سائنس سے نامانوسیت

ایک بے معنی چیز ہے۔

جو آیت کریمہ۔ رب اکرم کی طرف سے انسان کو معزز و مکرم بنانے کے لیے ایک قلب مطہر پر پہلے دن غار حرا میں نازل ہوئی اُسنے بھی اس امر کا انکشاف کیا کہ اب ربِ اکرم انسان کو عزت پر پہنچانا چاہتا ہے اور وہ دو چیزوں سے ایسا کرے گا۔ پہلا ذریعہ تو لکھنا پڑھنا ہوگا اور دوسرا ذریعہ وہ علوم ہوں گے جن سے کل کی کل نسل انسان ظہور اسلام سے پہلے ناواقف تھی اُنہیں سائنس کہیے یا علوم جدیدہ (مالم یعلم)۔

اللھم صل علی محمدؐ و علی آل محمدؐ

ربوبیت مالکیت

اقتصادیات میں مغربی تنگ نظری

بائیبل نے تو فلسفۂ حیات کے ان مسائل کی طرف چنداں توجہ کرنے کی تکلیف نہ کی جسکا تعلق اس دنیا سے تھا حتیٰ کہ جناب مسیحؑ نے تو صاف ہی کہہ دیا کہ [illegible] بادشاہت [illegible] لیکن فلسفۂ [illegible] کا یہ مقصد [illegible] بھی پریشان [illegible]

ﷺ اقرأ باسم ربك الذي خلق ۝ خلق الانسان من علق ۝ اقرأ وربك الاكرم ۝ الذي علم بالقلم ۝ علم الانسان ما لم يعلم ۝ (سورۃ العلق)

یہ دیکھا کہ اُن کا مذہب انہیں اصلاحِ معاشرت میں نہ صرف مدد نہیں دیتا بلکہ اُن کی دنیوی اور مادی ترقی کا حارج بھی ہے۔ انھوں نے مذہب کا جُوا اپنی گردن سے اُتار پھینکا اور خود فلسفۂ حیات کے مطالعہ میں لگ گئے۔ اِس جستجو میں اگر الہامِ قرآن اُن کا مشعلِ راہ ہو جاتا تو یہ قومیں دنیا کے لیے رحمت کا موجب ہو جاتیں جیسے کہ مسلم اسلاف بنے۔

مطالعہ فطرت نے اُن پر یہ ظاہر کیا کہ کائنات کی ہر ایک چیز اپنی بقا وحیات کے لیئے سرتوڑ کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ انہیں یہ بھی نظر آیا کہ بعض اشیاء کائنات کی بقا وحیات دوسری کی ہلاکت وموت سے وابستہ ہے۔ ایک مخلوق دوسری کی خوراک بن رہی ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر جس امر پر وہ بطور صداقت حقہ قائم ہو گئے۔ وہ **بقائے للاقوی** کا نظریہ ہے۔ یعنی اِس کائنات میں وہی حیات وبقا کا مالک ہو سکتا ہے جو قوت وطاقت میں دوسروں پر فوقیت رکھتا ہو۔ جہاں تک تو مخلوقات کی ایک نوع کا دوسری نوعِ مخلوقات سے تعلق ہے۔ یہ مسئلہ ایک صداقت حقہ ہے۔ درندے جانور بالضرور پرندوں کو اپنی خوراک بنا لیتے ہیں لیکن ایک ہی نوع کے افراد تو کائنات میں ایک دوسرے کو کھاتے نظر نہیں آتے۔ وہ تو ایک دوسرے کی حیات وبقاء کے ممد ومعاون ہی واقع ہوئے ہیں۔ کہنے کو تو یہ عام طور پر لوگ کہا کرتے ہیں کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔ لیکن ماہران اشیاء طبیعیہ نے اب یہ تحقیق کر دیا ہے کہ یہ چھوٹی بڑی مچھلیاں اپنی نوعیت میں ایک دوسری سے بالکل

مختلف ہوتی ہیں۔ وہ اوپر سے اوپر کی جنسیت میں خواہ ایک ہوں لیکن نوعیت میں بالکل جداگانہ ہوتی ہیں۔ الغرض یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ایک ہی نوع کے افراد ایک دوسرے کے ہالک واقع نہیں ہوتے بعض بیلیں ضرور درختوں پر چڑھ کر ان کی ہلاکت کا موجب ہو جاتی ہیں لیکن کوئی بیل یا ادنیٰ درخت اپنی نوع کی بیل یا درخت کو کھاتا نظر نہیں آتا۔ بلکہ کائنات میں تو افرادِ نوع میں تعاون ہی تعاون نظر آتا ہے اور پھر حیرت کا مقام ہے کہ کائنات کی ان اشیا میں تو استعدادِ تعقل و تمدن بھی نہیں۔ نہ اُن میں خالقِ فطرت نے ہمدردی یا مواسات کا جوہر رکھا ہے پھر انسان کیوں ان جواہر فطریہ کے ہوتے ہوئے اپنی قیام بقار کو دوسرے انسانوں کی ہلاکت سے وابستہ کر رہا ہے؟

بہرحال اس مسئلہ "بقا للاقوی" کے غلط مفہوم نے مغرب میں **قومیت و وطنیت** کا ایک غلط اور تنگ نظریہ پیدا کر دیا ہے۔ اگر وہ اس مسئلہ سے یہ سمجھتے کہ قومی بقا و حیات کا قیام قومی قوت سے ہی وابستہ ہے تو وہ حق بجانب تھے۔ اگرچہ قرآن کریم نے قوت کی جگہ تقویٰ اور صلاحیت کو بقار کی شرط قرار دیا ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ اقوام مغرب نے اسکے ساتھ یہ بھی فرض کر لیا ہے کہ جن اقوام میں بقار کی صلاحیت و قوت نہیں وہ زندگی کی بھی مستحق نہیں۔ اور قوی قوموں کو یہ حق حاصل ہے کہ ضعیف قوموں کو اُس وقت تک دنیا میں رہنے دیں جب تک کہ وہ انکی خدمت کر سکیں یہ فلسفہ گو بذاتِ خود مکروہ تھا لیکن اسپر یہ بھی اضافہ کیا گیا کہ چونکہ

ایک قوم کی تقویت دوسری کی تضعیف پر منحصر ہوتی ہے۔ اسلیئے حکمران قوموں کو اپنی قوت کے قیام کے لیئے محکوم قوموں کی تضعیف کے اسباب پیدا کرنے چاہیئیں۔ اس دشمنِ انسانیت فلسفہ کی طرف قرآنِ مجید نے بھی فرعون کے قصہ میں اشارہ کیا کہ ایک طرف تو وہ قبطیوں کو دن بدن مضبوط کرتا تھا اور دوسری طرف اسرائیلیوں کے ضعف کو بڑھاتا جاتا تھا۔ بیشک تم اپنی طاقت کے قیام کے لیئے ہر قسم کی قوت صلاحیت کے اسباب پیدا کرو۔ اور یہ وہ بات ہے جس کی سفارش خود خدا کی فعلی و قولی کتاب کرتی ہے۔ لیکن یہ کسی فرد یا قوم کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے افراد یا قوموں کو زندہ ہی رہنے نہ دے۔

الغرض یہ مہلک انسانیت مسئلہ موجودہ میٹریلزم (مذہبِ مادیت) کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ چونکہ مغربی قومیں اپنے تمدن کے باعث قابلِ اتباع سمجھی گئی ہیں اور اس اصول کو مغربی تمدنِ اقتصاد کی جزوِ لاینفک قرار دیا گیا ہے۔ اسلیئے اسکی اتباع مشرقی قوموں نے بھی شروع کر دی ہے اور ان میں افسوس تو یہ ہے کہ بعض اسلامی قومیں بھی شامل ہوتی جاتی ہیں۔ اس اتباع کا پہلا قدم عربوں اور ترکوں کی جدائیگی تھی۔ جس کے لیئے عربوں میں قومیت اور وطنیت کی یہ مادیت زدہ ذہنیت پیدا کی گئی۔ بالمقابل اسی نے ایک حد تک اسلامی خلافت کا خاتمہ کیا۔ اور اب اسی نے ہندو مسلمانوں میں اس قومی تصادم کو پیدا کر دیا جو بدقسمتی سے آج ہندوستان میں نظر آتا ہے۔ اسی مسئلے نے عام طور پر یہ ذہنیت بھی پیدا کر دی ہے کہ ایک

قوم دوسری قوم سے بالکل جدا ہو جائے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ انفرادی شخصیت پر ہی شخصی یا قومی بقا و قیام بہت حد تک منحصر ہے والا کمزور افراد یا قومیں طاقتور قوموں میں مخلوط و مدغم ہوکر اپنی اپنی ہستی کو گنوا بیٹھیں گی۔ لیکن انفرادی شخصیت کے قیام کو دوسروں[۵] کی ہلاکت یا کمزوری سے وابستہ کردینا یہ وہ ظلم عظیم ہے جو انسانیت سے کوسوں دور ہے اور رب کائنات کو پسند نہیں۔ جن قوموں نے یہ وطیرہ اختیار کیا وہ آخر ہلاک ہوگئیں۔ فرعون کا قصہ تو ایک مذہبی داستان ہے۔ لیکن رومی سلطنت کی تاریخ زوال بین اور نمایاں الفاظ میں پکار رہی ہے کہ جس قوم نے اپنی تقویت و تعیشات کو دوسروں کی تضعیف سے عملاً وابستہ کردیا وہ اس طرح مٹ گئی کہ دنیا میں اسکا نام و نشان تک باقی نہیں رہا اور یہ اس لیئے کہ یہ امر رب العالمین کی منشاء و مشیئت کے خلاف ہے۔

۵؎ یورپ نے تو ان نظریوں پر عمل کرکے اپنے مختصر سے مختصر براعظم کو پچیس[۲۵] تیئیس[۲۳] قوموں میں تقسیم کردیا۔ اور اسی نے اس زمین کو ایک مدت سے تختۂ کشت و خون بنا رکھا ہے اسیطرح اس مسئلہ نے عمل میں آکر اسٹریلیا اور امریکہ کی قدیم قوموں کو نیست و نابود کردیا۔ اور اب یہ مسئلہ افریقہ میں کام کررہا ہے۔ لیکن ہندوستان تو جہانتک ہندو مسلم سوال ہے اس مسئلہ پر عمل کیئے جانے کا متحمل ہی نہیں۔ اگر ہندوستان کے مختلف صوبجات میں ایک ہی مذہب و ملت کے افراد جدا جدا آباد ہوتے تو تو بھی ایک بات تھی۔ یہ تو یہاں صورت ہی نہیں۔ اس مسئلے پر عمل اس جگہ اس قومی عداوت و منافرت اور باہمی وحشت کو اور بڑھادیگا جس سے ہندو مسلمان دونوں ایک دن تباہ ہو جائیں گے۔

اقتصادیات حاضرہ کا ایک اور پہلو

ایمان بر ربّ العالمین پر اعتراض

ربّ العالمین کی ربوبیت کسی خاص قوم سے تو وابستہ نہیں۔ آسمانی مشیئت تو یہی ہے کہ ہر قوم جئے اور دوسروں کو جینے دے۔ بلکہ ایک نوع کے مختلف افراد مسئلہ حیات کے حل کرنے میں ایک دوسرے کو امداد دیں۔ بالمقابل مذہب مادیت اس امر کی یہانتک ہی اجازت دیتا ہے کہ ایک قوم کے مختلف افراد تو تعاون پر عمل کریں لیکن حدود قومی سے باہر اس تعاون کی وہ چنداں ضرورت نہیں سمجھتی گو جہاں بھی مادیت کی روح زور میں آئی وہاں ایک ہی قوم کے مختلف افراد میں بھی خطرناک تصادم پیدا ہو گیا۔ چنانچہ سرمایہ و محنت کی جنگ یا اشتراکیت اور ملکیت پرستی کے تنازعے اُسی تصادم کی ایک تشریح ہے جو ایک ہی ملک کے اندر ایک ہی قوم میں پیدا ہو جاتے ہیں"

کہا جاتا ہے کہ ربّ العالمین پر ایمان ہمدردیٔ بنی نوع کی جس وسعت کو چاہتا ہے وہ قومی مفاد اور شخصیت ذاتی کے قیام کے منافی ہے۔ اسلئے ہماری زندگی اور بہبودی یا قومی استحکام و استقلال اسی میں ہے کہ ہم دوسری قوموں سے بہت کم تعلق رکھیں بلکہ قومیت کو مذہب پر بھی فوقیت دیدیں۔ چنانچہ

"میں پہلے ہندوستانی ہوں، اور پھر مسلمان"

کا ترانہ اسی ذہنیت نے پیدا کیا"

اگر یہ صحیح ہے کہ ایمان بر ربّ العالمین کی وسعتِ عمل کسی کو ایسے افعال سے

روکتی ہے کہ جس سے وہ حقوقِ ذاتی یا قومی کی حفاظت نہ کر سکے یا یہ ایمان اُس لامحدود ہمدردی کو پیدا کرتا ہے جو حفاظت خود اختیاری کی سپرٹ کو مار کر کسی قوم یا فرد کو دوسروں کا تختۂ ظلم بنا دے تو یہ ایمان کسی خیر و برکت کا موجب نہیں ہو سکتا۔ اور اسے جتنی جلدی چھوڑ دیا جائے اچھا ہے۔ آج بدقسمتی سے ایسا ہی سمجھا گیا ہے اور یہ لوگ مذہب کو قومی استحکام کا مخالف قرار دیتے ہیں۔ اور تو اور خود ترک، افغان اور ایران میں بعض پرستارانِ مادیت اس وقت اسی طرف جا رہے ہیں۔ یہ کوئی بھی غور نہیں کرتا کہ قرآن حکیم اگر انسانی قومی اور شخصی بہبودی کے لیئے خدا کی آخری ہدایت ہے تو اسمیں ایمان برب العالمین کے اِس منفی صنف نقصان کا ردِ عمل بھی موجود ہوگا۔ غور کرنے کی بجائے سردست تو یہ کہا جاتا ہے اور وہ اِس لیئے کہ ابھی مسلمانوں کو مذہب سے کچھ تعلق ہے کہ مذہب کو سیاسیات قوم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی بات کچھ پہلے مغربی قومیں کہتی تھیں لیکن مغرب کی طرح یہاں بھی وہ دن آنیوالا ہے جب مسلم قومیں بعض تعلیماتِ مذاہب کو استحکام قوم کا دشمن سمجھ کر آخر کار اسے بالائے طاق رکھ دیں گی۔ جیسے ہندو بھائیوں نے کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہندو مذہب کے بعض فلسفی مسائل مثلاً مسئلہ مایہ وغیرہ اور جناب مسیح علیہ السلام کا خطبہ کوہی تو بیشک استحکام و استقلال فرادی و قومی کے منافی وضع ہوئے ہیں۔ اور قومی مفاد چاہتا ہے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ لیکن قرآن حکیم کے بھیجنے والے نے ابتدا ہی میں

اپنا نام **ربّ العلمین** اور **مالک یوم الدین**
رکھا ہے۔ اسکے قوانینِ ربوبیت کے ساتھ ساتھ قوانینِ مالکیت بھی چلتے ہیں۔ ربوبیت عالمین کے مقتضیات قوانینِ مالکیت کو بیکار نہیں کر دیتے اگر تعطل صفاتِ باریہ پر کسی مسلمان کا ایمان نہیں تو ربوبیت و مالکیت دونوں کی دونوں ایک ہی وقت کام کر رہی ہیں "

قرآنِ حکیم نے انسان کو زمین پر خدا کا خلیفہ قرار دیا ہے۔ اس کتاب پاک نے مذہب کی غرض و غایت یہ بیان کی ہے کہ انسان کے قول، فعل اسکا تصور و تخیل ربانی رنگ (صِبْغَةَ اللّٰہ) اختیار کرے۔ اسی کیطرف حدیث کے مقدس الفاظ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ (تم اپنے میں اخلاق خداوندی پیدا کرو) اشارہ کرتے ہیں۔ اس لیے قرآن کریم نے خدا کے وہ ننانوے اسمائے حسنہ بیان فرمائے۔ جن کا رنگ ہم میں پیدا ہو سکتا ہے[1]۔ انہیں اسمائے حسنہ میں ایک پاک نام مالک ہے "

---

[1] انشاء اللہ عنقریب میں ایک کتاب اسمائے حسنہ پر لکھنے والا ہوں۔ اسمیں دکھلانا چاہتا ہوں کہ اگر انسانی سوسائٹی کی بنیاد ان اسماء کی مقتضیات پر ہو تو وہ سوسائٹی اپنے انتظام و انصرام میں فلاح و تمدن انسانی کے لیے ایک بہترین سوسائٹی ہوگی۔ وہ مسلم قومیں جو اسوقت استقلال قومی کے لیے پیدا ہو گئی ہیں وہ مغربی تمدن و میٹریلیزم کو چھوڑ کر کیوں قرآن کے بیان کردہ اسمائے حسنہ کو امور ملک اور نظام سوسائٹی میں اپنا ہادی راہ نہیں بناتیں۔ ان تمام امور کا ذکر انشاء اللہ اس کتاب میں ہوگا۔ میں نے اسکا نام آسمانی بادشاہت اور اسکا دستور (چارٹر) تجویز کیا ہے ۱۲

میں نے بیان کیا ہے کہ سورۂ فاتحہ کی بیان کردہ صفاتِ اربعہ (رب رحمٰن۔ رحیم۔ مالک) کل صفاتِ باری کے لیئے بطور اُمّ الصفات واقع ہوئی ہیں جس طرح پہلے تین نام بہت سی صفاتِ باریہ پر حاوی ہیں اسی طرح اسم مالک بھی اپنے اندر کئی ایک صفات کو شامل کر لیتا ہے۔ قہار۔ جبار۔ عادل گستر۔ حفیظ۔ حافظ۔ عزیز۔ ذو انتقام۔ سریع الحساب۔ عذاب عقاب کا دینے والا۔ علیم۔ خبیر۔ بصیر۔ سمیع۔ مجیب۔ مالک ظالمین۔ یہ سب مالکیت کی مختلف شکلیں ہیں۔ وہ اپنی ملکیت یا مملکت کے قیام و حفاظت میں اسقدر بیدار ہے کہ نیند چھوڑ اُسپر اونگھ تک بھی غالب نہیں آتی[1] الغرض ملکیت کی حفاظت یا اُسکے قیام و افزائش کے وہ کون سے طریق ہیں جو قرآن حکیم نے بیان نہیں کیئے۔ ہاں اُسکے طریقوں میں ظلم کو راہ نہیں۔ سورۂ فاتحہ نے ربوبیّت عالمین کے ساتھ ہی مالکیّت کا ذکر کر کے صاف ہدایت فرمادی کہ تم شخصی یا قومی استحکام و استقلال میں اپنے تمام مالکانہ حقوق کو برتو۔ لیکن اُس قسم کے تصرفات سے بچو جو دوسروں کے حقوق کا اتلاف کریں۔ کیونکہ تم رب العالمین کے پرستار ہو اور وہ چاہتا ہے کہ تم خود جیو اور دوسروں کو جینے دو۔ بلکہ دوسروں کے زندہ رکھنے میں احسان و مروت سے بھی کام لو۔ رب العالمین یہ نہیں چاہتا کہ اُن ظالموں کا تدارک نہ کرو جو تمہیں زندہ نہ رہنے دیں یا تمہیں اپنی زمینوں سے نکال دیں یا ایسے اسباب

---

[1] اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ

پیدا کریں جس سے تمہاری زندگی جینے کے قابل نہ رہے۔ وہ رب ہوکر ایسے ظالموں کو بحیثیت مالک ہلاک کر دیتا ہے۔ اور پھر مظلوم کو ہی ایسے ظالم کا قائم مقام بناتا ہے۔ اس رب العالمین نے جہاں تبقاضائے رحیمیت احسان کی تعلیم دی ہے وہاں تبقاضائے مالکیت عدل کا بھی حکم دیا ہے بلکہ عدل کو احسان پر مقدم رکھا ہے۔ اُسنے اُن راہوں سے روکا ہے جن سے کسی جماعت کے انفرادی یا قومی یا ملکی حقوق تباہ ہوں۔ حفاظت ملکیت میں وہ کون سی سیاسی یا تعزیری بات ہے۔ جس کی اجازت عدل نہیں دیتا۔ بلکہ مالکیت کے ساتھ عدل کو وابستہ کرکے قرآن نے انسان کو ظالمانہ راہوں سے بھی روک دیا ہے جسکی تعلیم آج مادیت پرستی دنیا کو دے رہی ہے۔ عدل یہ بھی چاہتا ہے کہ ہر جگہ قومی اور انفرادی شخصیت قائم ہو۔ اور اُس کا تقاضا ہے کہ ایک قوم دوسری کو غلام نہ بنائے۔ رب

لہ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝ وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (سورۃ ابراہیم۔ آیت ۱۳-۱۵)

ترجمہ:۔ اور جو کافر تھے انہوں نے اپنے رسولوں کو کہا ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دینگے یا تمہیں ہمارے مذہب میں آجانا ہوگا۔ سو ان کے ربنے ان کی طرف وحی کی کہ ہم یقیناً ظالموں کو ہلاک کر دینگے اور یقیناً ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کرینگے۔ یہ اُسکے لیے ہے جو میرے مقام سے اور میرے (عذاب کے) وعدہ سے ڈرتا ہے ۱۲ (فٹ نوٹ)

العالمین تو منتقم بھی ہے یعنی ظالموں سے بدلا لیتا ہے۔ اور ہم کو بدلا لینے کا حکم دیتا ہے۔ ولی القصاص حیوۃ یٰاولی الالباب ۔(اے عقلمندو! قصاص کے ساتھ تو ایک طرح حیات ہی وابستہ ہے) ہاں جہاں اُس نے اپنی انتقامی صفت کا ذکر کیا ہے وہاں اپنا نام عَزِیْزٌ ذُوانْتِقَام رکھا ہے۔ اسمیں اشارہ ہے کہ تم ظالمانہ طریق پر انتقام نہ لو۔ اُسی حد تک انتقام لو جہاں تک تمہاری عزت کے قیام کا سوال ہے۔ اگر کسی کا فعل تمہاری عزت پر حملہ کرے تو تم پر انتقام لازم آگیا۔ عزت کا لفظ عربی زبان میں بہت وسیع المفہوم ہے۔ تمکنت۔ استقامت۔ استقلال سب لفظ عزت کی ہی مختلف شاخیں ہیں۔ ان سب پر کسی کا حملہ انتقام کا موجب ہو سکتا ہے الغرض ایک مسلم کو ایک نماز میں رب العالمین اور مالک فداپہ یاد دلاتا ہے کہ اپنے مالکانہ حقوق کے اجرا و حفاظت میں وہ سب کچھ کرے لیکن ظلم نہ کرے اور دیگر افراد و اقوام کی حق تلفی نہ کرے۔ بالمقابل رب العالمین کی کسی بھی پرستاری میں اسکی نرمی وہاں تک نہ پہنچ جائے کہ جس سے اسکی اپنی شخصیت یا ملکیت مٹ جائے ۔

اخلاق و روحانیت

تشریح بالا سے ایک شخص سمجھ سکتا ہے کہ اقتصادیات یا کسب معاش میں اگر انسان کے افعال کسی صحیح ضابطۂ اخلاق کے ماتحت نہ ہوں تو اسکی جدو جہد معاش عموماً دوسروں کی تباہی اور نقصان کا موجب ہو جاتی ہے

ہر انسانی سوسائٹی یا حکومت ایسے قانون تجویز کردیتی ہے جن کے ماتحت معاشی سرگرمیوں میں ایک کا فعل دوسرے کے لیئے موجب ضرر نہ ہوجائے ایک متمدن سوسائٹی میں یہ امر تو ممکن ہے لیکن انسانی حکومت کسی کے دل میں اُس ایثار کو یا اس احسان و مروت کے جذبے کو جوش زن نہیں کرسکتی جس سے ایک ذی حیثیت شخص ایک غریب و مفلس کا ممدو معاون ہوکر عامہ غربت یا تنگ دستی کو کل کی کل افراد سوسائٹی سے دور کردے۔ متمدن قوموں میں اتلاف حقوق کی روک یا ثمرات محنت کی حفاظت ہوجاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اخلاق صحیح کے نہ ہونے کے باعث دولت و اسباب معاش کی تقسیم کچھ ایسے بے لگام طریق پر ہوتی ہے کہ اگر ایک طرف بعض گھروں میں زر و مال کی نہریں ہی چلتی ہیں تو دوسری طرف بیشمار گھر افلاس کا آخری منظر پیش کرتے ہیں۔ دولت کی یہ بدعنوان تقسیم اگر غیر یا کم متمدن قوموں میں جرائم پیدا کرتی ہے تو پابند قوانین سوسائیٹیوں میں سرمایہ و محنت کے جنگ کا باعث ہوجاتی ہے۔ اشتراکیت اور اقتدار پرستی کے تنازعات اسی کا کرشمہ ہے۔ انسانی سوسائٹی اس تصادم کو ہٹا نہیں سکتی۔ اسکا علاج صرف اُس بے نفسی اور ایثار سے ہی ہوسکتا ہے۔ جو مذہب اپنی اعلےٰ تعلیم سے پیدا کردیتا ہے

یوں تو مادیت پرستی نے حسنِ معاشیات کی قریب قریب وہی راہیں مغربی اقوام کو سکھلائیں جنپر سورۂ فاتحہ کے اسمائے حسنہ نے

قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو قائم کیا لیکن آخر الذکر سوسائٹی میں وہ اقتصادی جدال نظر نہیں آتا جسکی بھیانک تصویر آج مغرب میں نظر آتی ہے اسکا ایک ہی باعث ہے قرآن پر عمل کرنے والوں کے سامنے حصولِ معاش میں آٹھوں پہر ربّ رحمٰن رحیم اور مالک خدا تھا انہوں نے اپنی ہر جدوجہد میں وہ معاشی ہو یا اخلاقی ان اخلاق کے خدا کی پیروی کی اگر خدائے مالک نے انہیں حصول و حفاظتِ ملکیت کی راہ دکھلائی تو اس نے حسبِ تشریح بالا انہیں عدل کا بھی سبق دیا۔ جسکے ماتحت وہ اپنا حق کو لیتے اور دوسرے کو اسکا حق دیدیتے۔ جہاں خدائے رحیم نے انہیں یہ تعلیم دی کہ اُن کا ہر فعل اگر صحیح طریق پر ہو تو ان کا معاوضہ اُن کے عمل کے مقابل بہت زیادہ ہوگا۔ وہاں انہیں یہ بھی سبق دیا گیا کہ وہ خدا جیسے زبردست انسانوں سے ویسے ہی رحیمانہ سلوک کریں۔ وہ بقول پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف کسی مزدور کی محنت کا معاوضہ اسکے عرقِ پیشانی کے خشک ہونے سے پہلے دیدیں بلکہ اگر ممکن ہو تو اُسے اُسکی محنت کا کئی گنا معاوضہ دے دیں کیونکہ خدائے رحیم کا سلوک اُن سے ایسا ہی ہوا ہے جس طرح رحمٰن نے ہماری آسائش کے سامان ہمارے عمل و استحقاق کے بغیر مہیا کیے ہیں ویسے ہی ہم بھی دوسروں کے لیے رحمٰن بن جائیں اور اپنی بخشش کے ماتحت بلا استحقاق دوسروں کو دے دیا کریں اگر ربّ العالمین نے اپنی نعمت کے دسترخوان پر صلائے عام دے رکھی ہے تو ہم بھی اپنی بخشش و عطایا احسان کی تقسیم میں کوئی تنگی [illegible]

یا لسانی لحاظ نہ کریں*

یاد رکھو روحانیت فوق العادۃ افعال یا خوارق کے ظہور سے وابستہ نہیں۔ یہ باتیں روحانی بندے میں خود بخود اطلاقاً پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور اگر روحانیت خدا کے رنگ میں رنگین ہونے سے پیدا ہوتی ہے تو یہ ربانی رنگ بھی ان کے حصے میں آجاتا ہے جو اخلاق الٰہیہ سے متخلق ہو جاتے ہیں۔ انہیں کا نام اخلاق فاضلہ ہے اور انہی کی تکمیل کا نام روحانیت ہے*

یوں تو اخلاقیات پر کوئی چاہے تو جلدوں کی جلدیں لکھدے اور اپنی تحریر میں کل مذاہب کے دستور اخلاق جمع کردے۔ لیکن ان سب تعلیمات کا عملی خلاصہ یہی ہے کہ جہد للبقاء میں کسی سے کسی کو نقصان نہ پہنچے اور ایک کے مکسوبات دوسرے کے لیئے نفع بخش ہوں۔ ان دو اصولوں کو سامنے رکھکر اسلام نے دو چار مختصر سے مختصر اصول انسان کے لیئے ہادئ عمل تجویز کردیئے۔ سب سے اول اگر اسلام کی تعریف کرتے ہوئے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم نے مخلوق الٰہیہ[1] سے شفقت کے ساتھ پیش آنے کو اسلام کی ایک جزو ضروری قرار دیا تو آپ نے یہ بھی فرمایا کہ مسلم وہ ہے جسکے ہاتھ اور زبان سے کسی کو نقصان نہ پہنچے آپکے یہ ارشادات قرآن کریم کے ایک حکم کی تشریح میں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ

[1] تعظیم لامر اللہ وشفقۃ لخلق اللہ ۔ (حدیث)

المنکر والبغی" یعنی لین دین میں اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم عدل کرو۔ اپنا حق لے لو۔ اور دوسرے کا حق دوسرے کو دیدو۔ بلکہ اگر کوئی ایک کام کرے تو اُسے عوض میں کئی گنا دو۔ اسکا نام احسان ہے۔ تمہارا سلوک اس سے بھی زیادہ بڑھ جائے۔ تم غیروں سے وہ مراعات برتو جو تم اپنے اقربا سے برتتے ہو۔ جہاں نہ کوئی مروت ہوتی ہے نہ کوئی احسان بلکہ یہ حسن سلوک ازخود تم سے سرزد ہوتا ہے ایسا ہی کسی کو کوئی ذاتی نقصان نہ پہنچاؤ۔ نہ کسی کے حقوق کا انکار کرو۔ اور نہ کوئی ایسا فعل کرو جس سے نظام سوسائٹی میں خلل آئے یہ اخلاق کا مختصر سے مختصر ضابطہ اُن تمام اخلاقی تعلیمات کا نچوڑ ہے جو کسی مذہب یا سوسائٹی نے تجویز کیا۔ بالمقابل یہ تین حسنات (عدل، احسان۔ ایتاءِ ذی القربیٰ) اور تین منہیات (فحش، منکر بغی) دراصل خدا کی صفات مالک، رحیم اور رحمٰن کے مقتضیات و مطالبات ہیں۔ یعنی اُس انسان میں مالکیت۔ رحیمیت اور رحمانیت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے جسکا دستور العمل آیت بالا ہو جاتی ہے وہی انسان اخلاق فاضلہ سے متصف ہو کر روحانیت کو پا لیتا ہے روحانیت اگر نفسانیت سے پاک ہونے پر ہی حاصل ہوتی ہے تو اِن صفات ربانی کی پیروی ہی سے تو نفسانیت پر کامل فنا طاری ہو جاتی ہے۔ ایسا انسان تو اپنے لیئے نہیں جیتا بلکہ اُسکی زندگی دوسروں کے لیئے وقف ہوتی ہے۔ وہ مالکانہ رنگ میں پوری جدوجہد

کر کے اپنے ملکوبات میں سے اسیقدر رکھتا ہے جو اُسکی بقا و حیات کے لیئے کافی ہو۔ باقی جو کچھ بھی اُسکا ہوتا ہے وہ اوروں کے لیئے ہوتا ہے۔ وہ کسیکا حق نہیں رکھتا۔ دوسروں کو ان کی محنت کے معاوضہ میں کئی گُنا دے دیتا ہے اور اپنی آسائش کے لیئے جن باتوں کو دوسرے روپیہ یا محنت کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتے وہ رحمٰن کا بندہ ان کے لیئے اِن ضروریات کو پیدا کر دیتا ہے۔ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کے لئے کسی طلب یا امیدِ معاوضہ کے بغیر اُنکی ضروریات کے پورا کرنے میں لگ جاتا ہے ویسے ہی یہ انسان اپنے یا بیگانے کی تمیز کے بغیر کل خلقِ خدا کی خدمت میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اُسکے کُنبے کی چار دیواری کل نسلِ انسانی پر محیط ہو جاتی ہے جس میں مذہب و قومیت کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا چونکہ رب العالمین نے بقولِ قرآن کل انسانوں کو ایک ہی کُنبے کے ممبر قرار دیا ہے۔ اُسکی بخششیں سب کے لیئے یکساں ہیں۔

الٰہیات

رب۔ رحمٰن۔ رحیم۔ مالک

الٰہیات کی بحث تو ایک بسیط بحث ہے۔ لیکن اس کی اساس و بنیاد خدا کی ذات۔ حشر و نشر۔ جزا و سزائے اعمال۔ حیات بعد الموت وغیرہ کے [illegible] وہ چند متمیز عقائد [illegible] جن میں کل کی کل نسل انسان ایک

دوسرے کے ساتھ اتفاق واختلاف کے زاویہ نگاہ سے مختلف جماعتوں میں تقسیم ہوسکتی ہے۔ باقی جو کچھ بعنوان الٰہیات کہا، یا لکھا گیا ہے وہ سب کا سب انہیں مذکورہ عقائد کی جزئیات ہے۔ یہاں میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ ان چار صفات باری تعالیٰ کا ماننے والا ان امور میں کیا عقیدہ رکھتا ہے۔

ہستی باریتعالیٰ ربوبیت نہ صرف تخلیق و پرورش کائنات کے مفہوم تک محدود بلکہ لغتِ عرب نے ایک طرف اور نظامِ کائنات نے دوسری طرف لفظِ ربوبیت کی جو تشریح کی ہے اسمیں تخلیق و پرورش کے علاوہ ایک قسم کی تقدیر (تجویز قوانین) بھی نظر آتی ہے کائنات کا ذرہ ذرہ اور انکی مختلف شکلیں اور ہیولے۔ انکی تراکیب ان کی بلوغت وارتقاء وغیرہ سب کے سب قانون کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کائنات کی ابتدائی سے ابتدائی صورت کو دیکھ لیا جائے۔ وہاں بھی قانون سے مفر نہیں۔ ہماری تحقیق عناصر سے آگے چلکر اب سالمات۔ اتمات اور تنویری ذرات (نیبیولا) کو بھی پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ اسوقت ہم اثیری ذرات تک پہنچ گئے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ان سے کائنات کا آغاز ہوا ہے۔ الغرض اگر ہماری تحقیق اثیری ذرات سے بھی ہمیں آگے لیجائے تو موادِ عالم پر ہر جگہ ایک نہ ایک قانون حکومت کرتا نظر آتا ہے۔ ان قوانین کے ساتھ نظامِ عالم میں ایک ارادہ اور اسکے ساتھ تدبیر و تنظیم الٰہی بھی نظر آتی ہے

اشیائے عالم کی ودلیعت شدہ استعدادیں ان استعدادوں کی بلوغت کی راہیں۔ اُن کی حدِکمال یہ سب کا سب پہلے ہی سے تجویز شدہ نظر آتا ہے۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کی طرف نہ صرف قرآن کریم لفظ رب کی تشریح کرتا ہوا اشارہ کرتا ہے بلکہ سائنس نے آج ان باتوں کو بطور امورِ مشتبہ تسلیم کر لیا ہے اور اسوجہ سے اہل سائنس کا غالب حصہ نہ صرف ہستیٔ باری تعالیٰ پر ایمان لے آیا ہے بلکہ مادہ پر اُس ہستی کی قدامت کو بھی تسلیم کر چکا ہے۔

قدامت مادہ انہیں پانچ سات سال کے اندر حکمائے مغرب نے مادہ کو قوت یا قدرت سے پیدا شدہ تسلیم کر لیا ہے جسکے یہ معنی ہیں کہ یہ مادہ جس کی قدامت پر بعض اصحاب ایمان رکھتے تھے وہ بھی آخر سائنس کی تحقیق میں حادث ہی ثابت ہوا وہ علمی بصیرت والوں کو رب قدیر کی قدرت کی ہی ایک بالغ شکل نظر آئی ہے۔

توحید وابنیت کل کے کل انتظام اور اُسکے نفاذ میں کہیں بھی شرکت عمل نظر نہیں آتی ایک ہی ہاتھ ہے جو ہر جگہ کام کر رہا ہے۔ اِس وحدتِ عمل کے ماتحت قرآن نے ربوبیت خداوند کو پیش کر کے الوہیت غیراللہ سے انکار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ رہا مسئلہ ابنیت اُسے صفت رحمانیت نے صاف کر دیا ہے۔ اپنی تقسیم فیضِ

لے ENERGY

رحمانیت میں خدائے تعالیٰ کہیں بھی تمیز و رعایت کرتا نظر نہیں آتا۔ ایک باپ خواہ کتنا ہی وسیع القلب اور نافع الناس ہو وہ اوروں کیساتھ حُسن سلوک کرتا ہوا اپنے بیٹے اور دوسروں میں کچھ نہ کچھ فرق کرہی دیتا ہے۔ لیکن مسیحؑ یا عزیرؑ یا دوسرے مقبولہ ابناء اللہ تو رحمانی انعام پانے میں دوسروں سے کسی رنگ میں ممتاز نظر نہیں آتے۔ اگر یہ بزرگ خدا کے بیٹے ہوتے تو وہ عطیہ فطرت رحمانی میں دوسروں سے کچھ زیادہ حصہ لیتے۔ لیکن یہ تو نظر نہیں آتا۔ اسلئے قرآن نے بھی کہا کہ اگر خدا رحمٰن ہے تو کوئی اسکا بیٹا[۱] کیسے ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی بخشش میں کسی کے ساتھ تفاوت[۲] نہیں کی۔

کفارہ یہ تو ظاہر ہے کہ رحمٰن کی رحمت بلا بدل واقع ہوئی ہے۔ یہ جو کچھ کائنات میں خدا کا عطیہ نظر آتا ہے وہ تو سب کا سب بے بدل ہے تو پھر وہ نظریہ بھی غلط ہوگیا جس نے الٰہیات کلیسا میں کفارہ تسلیم کرایا۔ صلیب پرست کہتے ہیں کہ خدا کا رحم بلا بدل نہیں ہوتا اس لیئے گناہ کی بخشش جس رحمت کو چاہتی ہے اسکے بدل میں کوئی فدیہ ہونا چاہیئے۔ لیکن بے بدل رحمتِ خداوندی نے اس مغالطے کو بھی دور کردیا۔

[۱] وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝ (سورہ مریم) ترجمہ اور کہتے ہیں (کہ) رحمٰن بیٹا رکھتا ہے ۱۲

[۲] مَا تَرٰى فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ (ملک آیت ۱) ترجمہ (تم) رحمٰن خدا کی پیدائش میں کچھ تفاوت نہیں دیکھتے ۱۲

تناسخ اِس بے بدل رحمت نے مسئلہ تناسخ[1] کی دقت کو بھی حل کردیا۔ ہمارے کل کے کل اسباب راحت تو قطعًا کائنات کی اُن اشیاء پر مبنی ہیں جو پیدائش انسان سے لاکھوں برس پہلے کے پیدا شدہ ہیں لیکن یہ تو کسی عمل کا نتیجہ نہیں۔ لہذا اگر سامان راحت عمل کے بغیر مل چکے ہیں تو مسئلہ تناسخ کی ایک وہ ضروری کڑی ٹوٹ جاتی ہے جسکے ماتحت یہ تسلیم کیا گیا کہ سامانِ رنج وراحت کسی پہلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر ایمان پر رحمن تناسخ کے مسئلہ کو ایک رنگ میں ناقابلِ تسلیم ٹھیراتا ہے تو ایمان بر ربوبیت اواگون کی بنیاد کو ہی اکھیڑ دیتا ہے۔ رب کی تشریح میں قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں ہر ایک چیز کا قدم آگے کو ہے پیچھے کو نہیں۔ اسکا جوہر مختلف عوارض ولباس بدلتا ہوا آگے ہی جاتا ہے۔ جو چیز پیچھے رہ جاتی ہے یا کسی شکل میں عود کرلیتی ہے وہ اسکے عوارضات ہیں۔ اس حقیقت پر سائنس نے بھی مہر صداقت لگادی ہے۔ لیکن اواگون تو ہم سے یہ منواتا ہے کہ ہم اعلیٰ حالت سے بھی ادنےٰ حالت کی طرف عود کرلیتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے۔ جس کی تردید ایک طرف لفظ رب اور دوسری طرف مسئلہ ایوولیشن (ارتقاء) کررہا ہے۔

حیات بعد الموت اگر ربوبیت کائنات نے جیسے کہ اوپر بیان ہؤا ہے ہر ایک چیز میں جوہر بلوغت رکھدیے ہیں اور

[1] مسئلہ تناسخ پر مفصل بحث کے لیے مصنف کی کتاب رد تناسخ دیکھو۔

یہی ربوبیت ان جواہر مخفیہ کو کمال تک پہنچا دیتی ہے خواہ وہاں تک پہنچنے میں ان اشیائے عالم کو ہزار در ہزار عالموں میں گزرنا پڑے تو پھر ہمیں ایک ایسے عالم یا عالموں کے وجود کو بھی ماننا پڑے گا۔ جن میں ہمیں موت کے بعد گزرنا باقی ہے کیونکہ ہر انسان کے اندر جسقدر استعدادیں ہیں وہ ساری کی ساری تو اس دنیا میں ظہور تام حاصل نہیں کرتیں۔ مثلاً کشف صدور یا دوسری باطنی قوتیں ہر انسان میں موجود ہیں۔ اور کئی ایک انسانوں میں یہ قوتیں کم و بیش ظاہر بھی ہو جاتی ہیں۔ لیکن نسل انسانی کا زیادہ حصہ ان قوتوں کی بلوغت کو نہیں دیکھتا۔ لہٰذا اگر کسی آنے والے عالم میں ان استعدادوں نے بالغ نہیں ہونا جو یہاں ظاہر نہیں ہوتیں تو پھر رب العالمین کا یہ فعل بھی عبث ہے جس نے ہر انسان میں طرح طرح کی استعدادیں رکھدی ہیں۔ اس حقیقت نے ہمیں حیات بعد الموت کے ماننے پر مجبور کر دیا ہے ؛

ضرورت الہام

اگر فیض رحمانیت نے انسان کی ہر خواہش و ضرورت کو بہم پہنچانے کا انتظام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اور ایسا ہی انسان کی ہر قوت کی آبیاری کے سامان بھی اُسکی طرف سے پیدا ہوتے ہیں تو پھر انسان میں جو حصول علم کی ایک طبعی تڑپ ہے بلکہ جس بات نے اُسے عالم حیوانات میں متمیز کر رکھا ہے وہ اُسکی قوتِ حصولِ علم ہی ہے کیونکہ جسمانیات میں تو انسان حیوان

سب برابر ہیں۔ اب اگر رحمٰن نے جسمی ترقیات کے سب سامان اپنی طرف سے دیئے ہیں تو علمی ترقی کے حقیقی سامان بھی اسی کی طرف سے آنے چاہئیں۔ یہی حقیقت ہمیں ضرورت الہام کے ماننے پر مجبور کرتی ہے اگر جسم کی غذا خدا نے دی ہے تو روح کی غذا بھی اپنی رحمانیت[1] کی طفیل ہمیں دے۔ اگر وہ رب العالمین ہے تو عالم حیوانات سے آگے چلکر جس عالم میں اب انسان نے گزرنا ہے وہ تو عالم اخلاق روحانیات ہے۔ اور اس عالم کی غذا کل کی کل قوت ادراک سے تعلق رکھتی ہے لہذا اس عالم کی خوراک بھی ادراکی رنگ میں ہی ہونی چاہیئے۔ بالفاظ دیگر اُس رب کی طرف سے الہام بطور رزقِ روح انسانی نازل ہونا چاہیئے اسی طرح صفت رحیمیت اور مالکیت بھی حیات بعد الموت میں بہشت و دوزخ کے وجود کی تعلیم دے رہی ہے۔ کیونکہ ان دونوں صفات کا تعلق جزا و سزا سے ہی جو بصورت تام اِس دنیا میں نظر نہیں آتی +

انسانی استعداد پر اسمائے حسنہ کا اثر

انسان کی فطرتی استعدادوں کو کسی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے اسمیں اقتصادیات۔ اخلاقیات۔ روحانیات اور الٰہیات کے متعلقہ علوم کے حصول کی استعداد موجود ہے۔ ہر ایک شخص خواہ

[1] الرحمٰن علم القرآن۔ یعنی قرآن کو صفت رحمانیت نے سکھایا ۱۲

وہ کسی عقیدہ کا ہو انہیں چار راہوں پر قدم مارتا نظر آتا ہے۔ مذہب اگر خدائی طرف سے آیا ہے تو اسکا فرض اولین ہے کہ ان چار امور میں قوائے انسانی کی آبیاری کرے ایسا ہی اگر الہام نے کوئی نماز تجویز کی تو وہ نماز ایک اہل صلوٰۃ کی ان چار امور میں راہنموئی کرے اور میں بلا تامل کہتا ہوں کہ اسلام نے اسی قسم کی نماز سکھلائی ہے۔ کل تعلیم اسلام یا تعلیم قرآن کا نچوڑ یہی چار صفات ہیں۔ ان چار اسمائ کی مختلف شیون کو سمجھانے کے لیئے خدا کا آخری الہام نازل ہوا۔ کیونکہ ہر جگہ کائنات میں خدا کے ان چار صفات کی حکومت چل رہی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اس آسمانی بادشاہت تلے وہی فلاح پا سکتا ہے جو اپنے حالات کو ان چار صفات کے منطوق و منشا کے مطابق کرے ۔

اب اقتصادیات ۔ اخلاقیات ۔ روحانیات اور الٰہیات کی کونسی بہتر سے بہتر راہ ہے ۔ جن کی طرف حسب تشریح بالا یہ چار صفات باری اشارہ نہیں کرتیں ۔ اسلامی نماز تو صرف اسی قدر ہے کہ انسان ان چار صفات پر غور و فکر کرے اور ان کے رنگ میں رنگین ہونے کی راہ نکالے ۔ باقی جن امور کی تعلیم سورۃ فاتحہ میں ہے ۔ وہ اس امر کی تعلیم کرتے ہیں کہ انسان نے اس کسب سلوک میں خود کیا کرنا ہے ۔ کن امور میں کسے اعانت و ہدایت کی ضرورت ہے ۔ کن راہوں پر اس نے چلنا ہے ۔ اور کن راہوں کو اس نے چھوڑنا

ہے۔ باقی تسبیحات و تکبیرات جو نماز میں داخل کی گئی ہیں وہ اسکی مکملات و متممات ہیں "

کسب سلوک اور اسکی راہیں

اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ

ترجمہ :- تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی اعانت طلب کرتے ہیں ہم کو صراط مستقیم کی ہدایت دے "

قرآن نے نازل ہوکر انسان کے نصب العین کو کسقدر رفعت و وسعت دی ہے جسکے حصول سے وہ نہ صرف اخلاق و روحانیت کی اونچی سے اونچی چوٹی پر جا متمکن ہوتا ہے بلکہ اُس منزل عالی تک پہنچتے پہنچتے اُسکی کل ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر ایک قوت بھی رو براہ ہو جاتی ہے۔ وہ نصب العین یہ ہے کہ انسان خدا کا خلیفہ بن کر اس کائنات پر اسکی طرف سے حکومت کرے۔ یوں تو ہر مذہب ملت نے مبہم طریق پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کسی نے میدان انسانیت میں وشنو کے اوتار دیکھے کسی نے انسان کو خدا کی تصویر سمجھا لیکن قرآن مقدس نے نہ صرف بین سے بین الفاظ میں اس منزل عالی کو واضح کرکے وہاں تک پہنچنے کی کھلی کھلی راہیں ہی بتا دیں

بلکہ اُن راہوں سے بھی متنبہ کر دیا جو انسان کی ملکوتی صفات کو بیکار کر کے اُسکی بہیمیت (خواہشات حیوانیہ) اور سبعیت (درندگی) کو اُسپر غالب کر دیتی ہیں۔ اور اِس طرح اُسے اسفل السافلین تک پہنچا دیتی ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ احسان کیا کہ اِن سب باتوں کو اجمالی طور سے سورۃ فاتحہ میں رکھکر اس الہامی دعا کو اُسکا پانچ وقتہ وظیفہ ٹھیرا دیا۔

اِس امر کی تشریح تو ہو چکی کہ خلافتِ الٓہیہ کا وارث وہی ہوتا ہے جو مذکورہ صفاتِ اربعہ کو بطورِ ظِل اپنے اندر پیدا کرے۔ بالفاظِ دیگر ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت، مالکیت وہ چار ربانی قالب ہیں کہ جن میں انسان نے اپنی کل کی کل استعدادوں کو جن میں اُسکی بہیمیت و سبعیت بھی شامل ہو ڈھال لینا ہے۔

انسان کی ارتقاء چونکہ حیوانیت سے ہوئی ہے۔ وہ اپنی موجودہ شکل میں بہیمیت و سبعیت کو بطور ورثہ اپنے ساتھ لایا ہے یہ بہیمی اور سبعی جذبات اُسکی فطرت میں اُسے جہد للبقاء میں مدد دینے کے لیئے رکھدئے گئے ہیں۔ ہماری تمام حرکات و سکنات ایسے ہی ہماری سب کوششیں عمل میں آہی نہیں سکتیں۔ اگر ہمیں بعض ضرورتیں لاحق نہ ہوں یہ ضروریات اپنی ابتدائی شکل میں وہی خواہشاتِ نفس ہیں جن کو بہیمیت سے تعلق ہے۔ بالمقابل ہمارے چاروں طرف وہ قوتیں بھی آٹھوں پہر کام کر رہی ہیں جن کے ضرر سے بچنے پر ہی ہم

زندہ رہ سکتے ہیں۔ ایک طرف تقاضاتِ نفس ہمیں طلب منفعت میں مصروف رکھتے ہیں تو دوسری طرف ہم مذکورہ بالا نقصانات سے بچنے کے لئے طرح طرح کی کوشش پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ گویا جد و جہد زندگی میں **جلب (حصول) منفعت و دفع مضرت** وہ ایک اہم مسئلہ ہے کہ جس پر چلنے کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ اب اگر جلب منفعت کا محور بہیمیت ہے تو دفع مضرت کی سرگرمیوں کی محرک ہماری سبعیت ہی۔ اور یہی دو طبیعتیں ہمارے اندر قوائے شہویہ (لوبھ) و غضبیہ (کرودھ) کی شکل میں ظاہر ہوئی ہیں۔ لہذا انسان میں ان دو قوتوں کا ہونا تو ضروریات سے ہی ہاں انسان کامل وہی ہوتا ہی جو ان دو حیوانی قوتوں پر قابو پالے۔ اور ان سے حسب ضرورت کام لے +

ماہرانِ نفسیات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ انسان کے کل قوائے نفسیہ خواہ وہ اخلاق حسنہ کی شکل میں ظاہر ہوں یا وہ اخلاق ذمیمہ بن جائیں۔ اُن سب کا سرچشمہ یہی دو قوتیں ہیں۔ یعنی نخل انسانی کی کل کی کل شاخیں لوبھ (قوائے شہویہ) اور کرودھ (غضب) کی ہی مختلف شکلیں ہیں۔ ان ہی دو جذبات طبعیہ نے طرح طرح کی تعدیل تہذیب کے ماتحت آکر آخرکار ان چار قالبوں میں ڈھلنا ہے جن کا میں نے اوپر ذکر کیا +

جب تک کوئی چیز سرسہ سانہ ہو جائے اور اگر وہ چیز دھات کی

قسم میں سے ہی آگ پر جا کر پانی کی طرح پگھل نہ جائے وہ کامل طور
پر کسی قالب میں ڈھل نہیں سکتی۔ انسان نے مذکورہ بالا مقام عالی
پر پہنچنے سے پہلے اپنے کل کے کل جذبات حیوانیہ کو بھی گو یا پیکر
سر بہ ساکر دینا ہے تو پھر وہ ان ربانی قالبوں میں ڈھلکر خدا کی تصویر بن
جائے گا۔ اگر قرآن کریم نے اس طریق عمل کا نام عبادت رکھا ہے تو عبادت
کے لغظی[۵۱] معنی ذُل یعنی پس جانا ہے۔ یوں تو اصطلاحًا اور رسمًا عبادت کے
لیئے۔ قیام۔ قعود۔ رکوع۔ سجود یا ہاتھوں کا باندھنا۔ یا انہیں کھڑا کرنا۔ اور
ان حرکات و سکنات کے ساتھ چند ماثورہ کلمات کا پڑھ لینا ہر مذہب
ملت نے تجویز کر دیئے ہیں۔ لیکن ان کی غرض و غایت بھی یہی ہے۔ عبادت
کے ابتدائی معنی تو پس جانے کے ہیں مگر اسکے دوسرے معنی وہ کامل اطاعت[۵۲]
انقیاد ہے جب انسان اپنے خیالات اور اپنے ارادوں سے قطعًا الگ ہو کر
اپنے حاکم یا معبود کی منشاء و حکم پر چلے یعنی اپنے ارادے اور منشاء کو معبود
کی منشاء میں مُتبدل کر دے۔ اسکا ہر قول و فعل خدا کے قول اور فعل کے
ماتحت ہو۔ وہ بے جان کی طرح ہو کر دوسرے کے ہاتھ میں چلا جائے یہی
وہ مقام ہے جس کی طرف قرآن پاک کی ایک اور آیت نے اشارہ کیا
ہے۔ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ (سورۂ بقر) یعنی انسان اپنے
نفس پر ایک قسم کی موت وارد کر کے خدا کی منشاء کے مطابق چلنے لا اسلم اپر

---

[۵۱] صحاح جوہری لغت قرآن ۱۲ [۵۲] قرآن کریم نے اس انقیاد کا نام دین رکھا ہے ۱۲

مستعد ہو جائے ۔ اور پھر اِس ارادے کو عمل میں بھی لے آئے ۔ اِس قسم کے انسان کا نام قرآن کریم نے مُسلم و محسن رکھا ہے ۔ اور اِن ہی دو صفات کے مجموعے کا نام مومن ہے ؛

اِس پر یہ اعتراض ہوگا کہ اِس قسم کا انقیاد تام ۔ آزادی رائے عمل پر چھری پھیر دینا ہے ۔ اگر آزادی کے معنی وہ آزادی ہے جس کا نام مادر پدر آزاد ہے تو اس آزادی پر جتنی جلدی چھری پھر جائے بہتر ہے اور اگر آزادی جائز کو اپنے کاروبار میں برتنے کے لیئے اُس علم حقہ کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے کہ جو ہر قسم کی خطا سے پاک ہو ۔ اور وہ علم ہمارے کل اعمال کا محرک ہو ۔ جن اعمال کے کرنے میں ہم ہر قسم کے خوف اور طعنہ سے نڈر ہو کر امور زندگی میں آزادی کے ساتھ گام زن ہو جائیں تو یہ وہ آزادی ہے جسکے لیئے قرآن کریم باآواز بلند تلقین کر رہا ہے کیونکہ اِسی علم و عمل کا نام ایمان ہے ؛

اس قسم کے پس جانے یا اپنے جذبات کو ربانی قالب میں ڈھالنے کا نام عبادت ہے اور حقیقی عبداللہ بھی وہی انسان کامل ہے جو مُردہ کی طرح ہو کر اپنے معبود کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے وہ جو کرتا ہے خدا کے حکم کے ماتحت کرتا ہے ۔ جو ہوتا ہے وہ بھی مشیت الٰہی کے ماتحت ہوتا ہے ہاں اس مقام پر پہنچنا کوئی آسان کام نہیں ۔ اِس راہ میں قدم قدم پر لغزش ہے ۔ اِس مقام پر پہنچنے تک بیسیوں اخلاقی اور روحانی جنگلوں پہاڑوں ۔ دریاؤں اور جھیلوں سے گزرنا پڑتا ہے ۔ [illegible]

کہ جس کا ہر ایک قدم ہادیٔ برحق کی اعانت چاہتا ہے۔ اسی لیئے سورۂ فاتحہ نے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ کے بعد اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہا۔ اِن منازل کے طے کرنے میں بیسیوں راہیں ہیں جو ٹیڑھی۔ الٹی۔ طویل اور گم گشتگیٔ منزل کی طرف جا رہی ہیں۔ ہمیں تو اِس سلوک میں کسی ایسی راہ کی ضرورت ہے جو مختصر سی مختصر ہو۔ اور سیدھا ہمیں منزل مقصود کی طرف لے جائے۔ اِسی رستہ کے لیئے ہمیں ہدایت ربّی کی ضرورت ہے۔ اور اسی پر قائم رہنے کے لیئے ہم اعانت کے طالب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے بعد اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کہتے ہیں۔ جسے یہ راہ مل گئی اور وہ اسپر گامزن ہوا وہی نصب العین مقام پر پہنچ گیا۔

ایک ضروری اخلاقی سبق

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ اِہۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ

ساری نماز تو باجماعت نہیں پڑھی جاتی۔ فرائض کے سوا سنتیں اور نوافل، انسان تنہا ہی پڑھتا ہے۔ لیکن الفاظ بالا (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ اور تجھ سے ہی اعانت طلب کرتے ہیں ہم کو راہ مستقیم دکھلا)۔ تو کسی فرد واحد کی طرف سے نہیں بولے جاتے۔ یہاں تو صیغۂ جمع استعمال کیا گیا ہے۔ اسمیں جو زبردست اخلاقی سبق تھا اُسے ہم بدقسمتی سے بھول گئے۔ ایک یہ امر ہے کہ ہم جناب باری میں صرف اپنے لیئے ہی دعا نہ کریں

بلکہ اوروں کے لیئے بھی دعا کریں۔ صرف اپنے لیئے ہی اعانت طلب نہ کریں
اور نہ اپنے کاروبار کے لیئے کسی صحیح راہ کے جویا ہوں بلکہ یہ دونوں باتیں
اوروں کے لیئے بھی چاہیں۔ اور پھر اُن کے ساتھ ملکر ہی بلکہ ایسے وقت
بھی جب وہ موجود نہ ہوں۔ کیا اس میں یہ اشارہ نہ تھا کہ تم کسی معاملہ
میں بھی صرف اپنی بھلائی کے خواہاں نہ ہو - بلکہ بھلائی و بہبودی کی راہیں
چننے میں یا اُن کے حصول میں اپنی ہی طرح دوسروں کا بھی خیال رکھو۔
اگر ہم ایسا کرتے تو کیوں ہم میں نفاق و تشتت پیدا ہوتا۔ دعا آخر ایک سفارش
ہی ہے۔ اور سفارش کنندہ کو ہمیشہ اُس شخص سے محبت و انس پیدا
ہو جاتی ہے۔ جسکے حق میں وہ سفارش کرے۔ اور سورۂ فاتحہ کا یہ حصہ تو
ہمیں دوسروں کی غیر حاضری میں اُنکے لیئے اُنہی فوائد کے طلب کرنے کی
ہدایت کرتا ہے جو فوائد کہ ہم اپنے لیئے مانگتے ہیں۔ یہ تو باہمی معاونت اور
حقیقی خُلت و اخوت کا ایک سبق ہے جو پانچوقتہ نمازیں ہمیں ملتا ہے
ہماری نمازیں کیوں بے تاثیر نہ ہوں۔ جب ہمارے اعمال ہمارے قول
کے خلاف ہیں۔ خدا کی جناب میں تو ہم دوسروں کے مفاد کے لیئے
آٹھوں پہر دست بدعا ہوں۔ اور عملاً ان کے گلے کاٹنے کے لیئے تیار
ہوں۔ یہ کس قسم کی منافقانہ زندگی ہے۔ جس میں ہم پڑگئے ہیں۔ اگر
آج بھی اِن اشارات ربّی پر عمل کرکے ہم عملاً دوسروں کے مفاد کے لیئے
ایسا ہی کوشاں ہوں جیسی اپنی ذات کے لیئے کوشش کرتے ہیں تو پھر
ہم میں وہ قومیت پیدا ہو سکتی ہے کہ جس کی اقلیت پر ہزار اکثریتیں قربان

ہوسکتی ہیں۔ اقلیت کوئی چیز نہیں۔ اتحاد واخوت ہی تھوڑوں کو بہتوں پر غالب کردیتی ہے۔ اور یہ وہ بات ہے جس کا وعدہ قرآن مجید بھی کرتا ہی کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً ۔ اس سے بھی بڑھکر ایک اور سبق سورۃ فاتحہ نے اِن الفاظ میں ہمیں سکھلایا ۔ گویا ربّ اسلام یہ دعا سکھلاکر ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ اسکی جناب میں دعا کے منظور ہونے کے دو ہی راستے ہیں۔ یا انسان ایک جماعت کو اپنے ساتھ لیکر کسی غرض کو خدا کی جناب میں متحدانہ رنگ میں پیش کرے یا جو مانگے وہ اپنے لیے ہی نہ مانگے بلکہ جماعت کے لیے مانگے۔ بالفاظ دیگر خدا کی جناب میں کسی خودغرض یا کسی خودپرست کی شنوائی ہی نہیں۔ جو شخص صرف اپنی ذات کے لیے کچھ مانگتا ہے۔ اسکی باتیں چنداں شنوائی کے قابل نہیں ہوتیں۔

یاد رکھو یہ وہ سبق ہے جو ہمیں اپنی پولیٹکل جدوجہد میں بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ نفس انسانی اپنی اصلی صورت میں اللہ تعالیٰ کی ایک عکسی تصویر ہے۔ یوں تو ہر ایک انسان استعداداً خلیفۃ اللہ ہے اور اُس کے جذبات اپنی شکل محمود میں صفات الٰہیہ کا ہی عکس ہے۔ لیکن شان ان وقت خلق اللہ کہلاتے ہیں۔ جب خدا کی جناب میں ایک مسلم کی درخواست ایک جماعت کی طرف سے ہی سُنی جاسکتی ہے تو ہم سیاسی حکام کے سامنے یکہ و تنہا جاکر یا اپنی جمعیت کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کس طرح کسی امر کے حصول میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ جب کسی مسجد میں ایک ہی وقت نماز

کی دو جماعتیں یا اُس سے زیادہ جائز نہیں تو پھر پولیٹیکل حکام کے آگے تم الگ الگ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کس کامیابی کے متمنی ہو رہے ہو۔ ہم کیوں ان سُنن آلہیہ سے سبق نہیں لیتے۔ اگر اتفاق و اتحاد کے یہ آداب صرف نماز ہی کے لیئے تھے تو تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی۔ نماز نے یہ باتیں تو ہمیں اسلیئے سکھلائیں کہ ہم روزانہ زندگی میں بھی ان آداب کا لحاظ کریں اور یہ تو آج بالبداہت نظر آرہا ہے کہ گورنمنٹ کے ہاں ہماری آواز وہ قدر و قیمت نہیں پاتی جو ہم سے سیکڑوں گنا کم سکھ اصحاب کی آواز کو نصیب ہے وہ چند لاکھ نفوس اور ہم کروڑوں کی تعداد میں وہ تو جو چاہیں گورنمنٹ سے منوالیں اور ہماری کوئی سنتا ہی نہیں۔ کیا یہ گورنمنٹ کا قصور ہے گورنمنٹ تو اخلاق آلہیہ پر کام کر رہی ہے۔ جب ہمارا خدا بھی جماعت کی ہی آواز کو سننا پسند کرتا ہے تو گورنمنٹ کیوں اُن کروڑوں کی آواز پر کان دھرے۔ جو چند لاکھ نفوس کی سی طاقت نہیں رکھتی۔

اتفاق و اتحاد چھوڑ۔ ہم تو ایک دوسرے کے دشمن ہیں اختلاف رائے جو بقول حضرت صلی اللہ علیہ وسلم موجب رحمت ہونی چاہیئے تھی آج ہم میں موجب عداوت ہو رہی ہے۔ کسی کی رائے سے اختلاف کرنا تو بری بات نہیں یہ تو ورثہ انسانیت ہے۔ لیکن آج جو اس خاصہ انسانیت کو استعمال کرے وہ دوسرے کی نگاہ میں مقہور و مغضوب ہو جاتا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ہم دوسروں کی رائے کی عزت کرتے لیکن ہم اُن کے اختلاف کا جواب نحیف الفاظ سے دیتے ہیں۔ کیا برادران وطن میں اختلاف نہیں ہوتا

کیا آج بھی ایک ہی گھر کے دو مقتدر ممبروں میں پولیٹکل اختلاف نہیں موتی لال نہرو۔ اور اُن کے صاحبزادے جواہر لال نہرو میں پولٹیکل اختلاف ہی لیکن وہ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ ایک ہی پلیٹ فارم پر ایک دوسرے کے مخالف تقریریں کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی اِن کی محبت میں فرق نہیں آتا۔ وہ تو اسلام کی اِس صداقت سے کہ اختلاف رحمت ہوتا ہے مستفیض ہو رہے ہیں۔ اور ہم اسے چھوڑ کر خسران کیطرف جا رہے ہیں۔ ہم اِس بات کی توقع ہی کیوں کرتے ہیں کہ دوسرے ہماری رائے کو مانیں۔ ہاں یہ بھی سچ ہے کہ بعض امور میں کثرت رائے بھی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ خصوصًا جب قلت کی حمایت میں تجربہ و بصیرت ہو۔ پھر بھی اختلاف کی عزت کر کے خُلت و محبت کے ساتھ ایک امر مشترک کے لیئے کوشاں ہونا اسلام نے سکھلایا ہے لیکن آج اگر اسلامی باتوں سے ہم نے منہ موڑ لیا تو کیا ہندو برادران کا طرز عمل ہمارے لیئے ایک سبق نہیں۔ وہ بھی اختلاف رائے پر ایک دوسرے کے مقابل آجاتے ہیں لیکن اغراض قومی کے حصول میں پھر وہ متحد ہو جاتے ہیں۔ کسی باجماعت نماز میں کل کے کل مقتدی تو ایک ہی خیال کے نہیں ہوتے۔ لیکن رب العالمین کی جناب میں تو ایک متفقہ آواز سے ہی اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کہتے ہیں۔ وقتی گورنمنٹ کے سامنے کیوں ہم میں یہ رنگ پیدا نہیں ہوتا۔

آج تو بدقسمتی سے سیاسی اختلافات ہمارے شیرازۂ قوم کو پراگندہ کر رہے ہیں۔ لیکن ان اختلافات و فسادات کی عادت تو مدت سے ہم میں پیدا ہوچکی ہے۔ اور عجیب بات یہ ہی کہ اسکا باعث ہماری جہالت سے وہی مذہب ہوگیا ہے جو اخوت جیسی نعمت دنیا میں لایا (فاصبحتم بنعمتہ اخوانا) وہی مذہب جسکی ایک ایک بات اتحاد و اتفاق کی جان تھی وہ فرقی تنازعات کے باعث کلمہ گوؤں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا رہا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اسلامی فرقی تنازعات تو اصولاً کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اور اس موضوع پر میں نے آٹھ سال ہوئے ایک مستقل کتاب[1] لکھی تھی۔ میں یہاں صرف اس وسعت قلب اور روح اتحاد کا ذکر کرتا ہوں جسے تعلیم قرآن نے قرون اولی کے مسلمانوں میں پیدا کر کے انہیں غیر مسلموں کی نگاہ میں بھی ہر دلعزیز کر دیا۔ اور یہی انکے اسلام کا موجب ہوگئی۔ تنازعات مذہبی میں عیسائی اور یہودیوں کے ساتھ جس اصول پر ایک مسلم کو پابند ہونے کی تعلیم قرآن نے دی وہ آج وہاں موجود ہے۔ غیر مسلموں سے تو ہم کیا سلوک کریں گے۔ کاش اُن احکام کی بجا آوری میں ہم ایک کلمہ گو سے ہی وہ معاملہ برتیں۔ جسکے لیئے قرآن کریم نے ایک یہودی اور عیسائی کے مقابل ہمیں تلقین کی۔ مذہبی تنازعات و جدال تو ایک طبعی بات ہی لیکن باہمی فساد

---

[1] اس کتاب کا نام "اسلام میں کوئی فرقہ نہیں" ہے۔

و مخاصمت کے مٹانے کے لیے مسلمانوں کو حکم ہوتا ہے کہ تم عیسائیوں اور یہودیوں کو یہ کہو۔ اتحاجوننا فی اللہ وھو ربنا وربکم ولنا اعمالنا ولکم اعمالکم ونحن لہ مخلصون ۱۳۲ (یعنی اے عیسائی اور یہود دوستو تم جو ہم سے مذہبی امور میں برسر جدال ہو۔ آخر کس لیئے۔ ہمارا اور تمہارا رب تو ایک ہی ہے۔ اسی کی پرستش کا نام مذہب ہے۔ ہم بھی اُسی رب کے ساتھ اخلاص رکھتے ہیں۔ اگر تعلیم مذہب نے اعمال مختلف پیدا کر دیئے ہیں تو پھر کیا ہوا تمہارے اعمال تمہارے ساتھ اور ہمارے اعمال ہمارے ساتھ۔ کوئی کسی کے اعمال کا جواب دہ نہ ہوگا۔ (ولا تسئلون عما کانوا یعملون ۱۳۵ تم اپنے اعمال کے نتائج بھگت لوگے ہم اپنے اعمال کے نتائج بھگت لیں گے (لکم دینکم ولی دین) پھر تنازعہ کس بات کا۔ یہ وہ محبت بھری اپیل ہے۔ جو ہر قسم کے کینے اور غصے کو فرو کر کے مخالفت و عداوت کو امن و آشتی میں بدل سکتی ہے جب معبود کل مخلوق کا ایک ہی۔ جس کی ربوبیت کے سامان (ھو ربنا وربکم) سب کے لیئے یکساں ہیں۔ اُس نے پرورش اور کامیابی کی راہیں سب کے لیئے ایک طرح کی کھول دی ہیں۔ اور انہی راہوں پر چلنے کا نام مذہب یا عبادت ہے تو پھر فساد کیوں ہو! خصوصًا جب اُسکے سامنے ہر ایک جدا جدا اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ قرآن کی اس تعلیم کی رو سے اگر ایک رب کا اشتراک متخاصب عنصر میں یگانگت پیدا کرنے کے لیئے کافی ہے تو پھر وہ قوم اپنی حالت پر خود غور کرلے۔ جسکے افراد ہیں

ایک بات چھوڑ کر ایک باتیں مذہباً مشترک ہیں۔ اگر اس اشتراک و مجانست کے ہوتے ہوئے، وہ قوم افتراق و شقاق کا شکار بن رہی ہے تو یاد رکھو کہ وہ قوم اب من حیث القوم دنیا میں نہیں رہ سکتی۔ اس متفرق گلے کے کھا جانے کو مختلف قسم کے بھیڑیے پیدا ہو چکے ہیں۔ قرآن کے نزدیک تو مذہبی اختلاف کی شدت کو کم کرنے کے لیے صرف یہ کہدینا کہ تمہارا اور ہمارا رب ایک ہی ہے کافی ہے۔ بالمقابل یہاں تو ایک فرقہ والا دوسرے فرقے والوں کو کہہ سکتا ہے کہ تمہارا رب اور ہمارا رب، تمہارا نبی اور ہمارا نبی، تمہارا قرآن اور ہمارا قرآن، تمہارا کعبہ اور ہمارا کعبہ۔ تمہارے مذہب کے ارکان اور ہمارے مذہب کے ارکان۔ تمہارے اعمال کے لیے اسوہ۔ اور ہمارے اعمال کے لیے اسوہ۔ الغرض جو جو امور تکمیل مذہب کے لیے ضروری ہیں۔ اُن سب میں ہم متحد و مشترک ہیں۔ اور آج تو تم یہ بھی کہنے لگ گئے ہو کہ یہ فرقی تنازعات فروعات میں ہیں تو پھر تنازعہ کس بات کا۔ یہ اختلاف و افتراق کیوں ہے۔ بالمقابل ہندو مذہب تو فساد و اختلاف کا سرچشمہ ہے اس کے ماتحت مختلف فرقے ہیں۔ مختلف مذہب ہیں۔ پھر اتحاد قومی کے لیے اور دراصل یہی مذہب کی جان ہونی چاہیئے وہ مذہب چھوڑنے کو تیار ہیں۔ اُن کے لیڈر قومی سنگھٹن کے لیے تمام مذہبی حدود کو پامال کرنے پر آچکے ہیں لیکن ہمیں تو یہ ضرورت نہیں۔ ہمیں تو اتحاد قومی کے لیے مذہب میں سے ایک شوشہ بھی

چھوڑنے کی حاجت نہیں۔ اسلام تو اتحاد قومی کی روح رواں ہے پھر ہم کہاں کے مسلمان ہیں جو بات بات پر ایک دوسرے کے دشمن ہو رہے ہیں۔ کسی ہندو باریک بیں نے کیا پتہ کی بات کہی ہے اسلام اگر اپنے فلسفہ کی بنا پر ہندوستان میں داخل ہوتا تو اُسے کوئی کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ کیونکہ ایک نہ ایک قسم کا فلسفہ تو ہندو مذہب میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ لیکن اسلام نے اگر یہاں آکر ہندو مذہب پر غلبہ پایا تو وہ اُسکی اخوّت عامہ تھی۔ آج وہ اخوّت اسلام میں نہیں۔ آج مبلغان اسلام کس بات کو پیش کرکے ہندوؤں کو اسلام کی تبلیغ کر سکتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں۔ بلکہ اسپر ایک اور بات ایزاد کرنی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہندو مذہب کو کسی رنگ میں اب اسلام کی ضرورت نہیں کیونکہ ہندو صاحبان اپنے مذہب کے نقص کو سمجھ لیا ہے۔ اور اُس ناقص اور نقصان رساں تعلیم سے تبرّا کر لیا ہے جس نے ہندو قوم میں ذات پات کی امتیاز کو پیدا کرکے اُن کے قومی استحکام کو تباہ کر رکھا تھا۔ انہوں نے اسلام سے ہی قومی سنگھٹن کا سبق لیا ہے۔ اب وہ کیوں مسلمان ہو کر ایک ایسی قوم کے ممبر بنے جن میں اتفاق کا نام نہیں جو ذاتیات اور نفسانیت پر اتحاد و استحکامِ قومی کو ہر آن واحد میں قربان کرنے کو تیار ہیں۔ اور جو اپنے نفاق کے باعث عنقریب صفحہ ہستی سے مٹنے والے ہیں۔ فاعتبروا یآاولی الابصار۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝

ترجمہ: (ہمیں وہ راہ دکھلا جو) انعام یافتوں کا رستہ ہو نہ وہ راستہ جو معضوب علیہم اور ضال کا ہو +

یہ وہ رستہ ہو جس پر انعام یافتہ گروہ چلا۔ اور یہ راہ مستقیم اُن راہوں سے بالکل الگ ہے۔ جن پر غضب زدہ یا غلام ضلالت چلتے ہیں۔ ان انعام یافتوں کا نام قرآن نے نبیؑ۔ صدیق۔ شہید اور صالحین رکھا ہے

لہ ختم نبوت کے بعد یا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اس وقت جو کسی اور نبوت کے قائل نظر آتے ہیں انہیں صراط الذین انعمت علیہم نے ہی ہوا دیا ہے۔ وہ اس طرح بحث کرتے ہیں کہ جب خود خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ دعا سکھلائی کہ ہم اُس ہادیٔ برحق سے وہ راہ طلب کریں جس پر انبیاءؑ چلے تو پھر اس راہ پر چلکر کیوں ہم نبی نہ بن جائیں۔ اگر اس نظریہ کو منطقی صُغرےٰ کُبرےٰ کی شکل میں رکھ دیا جائے تو عامی نگاہ میں یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ لیکن یہ تو ایک منطقی مغالطہ ہے اور کون سا منطقی مغالطہ ہوتا ہے جو بظاہر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ جس بات نے دھوکا دیا وہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے صحیح مفہوم کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوئی کسی لفظ یا فقرے کے کئی ایک معنی ہو سکتے ہیں۔ اور یہی منطقی مغالطہ کی بنیاد ہوتی ہے صحت استدلال منطق کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے قضایا میں جو لفظ بطور مبتدا و خبر استعمال کریں۔ ان الفاظ معانی کو (بقیہ بر صفحہ آیندہ)

یعنی اس راہ پر وہی چلنے کے قابل ہوتے ہیں جو انعام یافتہ جماعت کے اخلاق پیدا کر لیتے ہیں۔ اور وہ اُن اطوار خبیثہ سے پاک ہو جاتے ہیں جو غضب یا شہوت کا جوش کسی انسان میں پیدا کر دیتا ہے پیش ازیں کہ میں اِن تین راہوں کی تشریح کروں جن میں سے ایک کا نام صراط مستقیم ہے۔ اور دوسرے کا نام صراط مغضوب علیہم یا صراط ضلالت ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر برعایت

(بقیہ صفحہ ۱۰۵) صحیح تعیین کریں ؛

اب اگر صراط نبوت (صراط مستقیم) سے کوئی ایسے اعمال و افعال مراد ہیں۔ جن کے صادر ہونے پر منصب نبوت مل سکتا ہے۔ تو تو یہ دوسری بات ہے مگر قرآن کریم نے اِس بات کی تردید کی۔ منصب نبوت موہبت الٰہی ہے۔ یہ ایک وہبی عطیہ ہے۔ یہ کسبی کسب یا عمل کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک انتخاب ربی ہے۔ جسے چاہے خدا تعالیٰ اپنے بندوں میں سے اس منصب جلیلہ کے لیے چن لے جیسے کہ قرآن کریم نے فرمایا۔

انبیاء علیہم السلام کی زندگی کو اگر ہم دو حصوں میں تقسیم کریں یعنی ایک وہ حصہ زندگی جو نزول نبوت کے پہلے تھا۔ اور ایک وہ حصہ زندگی جو اس ماموریت کے بعد واقع ہوا۔ اور یہ دونوں حصہ زندگی۔ وہ دو راہیں ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں جنپر انبیاء علیہم السلام چلے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عمر کے چالیسویں برس خلعت نبوت سے ممتاز کیے گئے۔ یہ ظاہر ہے کہ چالیس سال سے پہلے کی زندگی کے باعث وہ نبی نہیں بنے۔ کیونکہ ایسا ماننے سے نبوت ایک امر مکسوبہ ہو جائے گا جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ (بقیہ برصفحہ آیندہ)

اختصار انسانی اخلاق پر کچھ بحث کروں۔ کیونکہ یہی اخلاق اِن تین راہوں میں سے کسی ایک راہ کی طرف ہمیں لے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر کر دوں کہ اِن ہر سہ اخلاق مختلفہ کی بنیاد و اساس کیا ہے۔

اوپر لکھا گیا ہے کہ ہمارے کل کے کل کاروبار یا ہمارے سب حرکات و سکنات جس مسئلہ کے ماتحت چلتے ہیں وہ جلب منفعت و دفع مضرت کا مسئلہ ہے۔ کسی ضرورت کے پیدا ہونے پر یا کسی قسم کی

(بقیہ صفحہ ۱۰۶) رہا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مابعد نبوت زندگی وہ بیشک ایسی زندگی ہے۔ جس پر وہ بحیثیت نبی گامزن ہوئے۔ اگر ان تیئیس سال کے کسی مرحلے پر یا اُسکے خاتمہ پر آپ کی نبوت میں اضافہ ہوتا یا پہلی نبوت کے علاوہ کوئی اور نبوت آپ کو عطا ہوتی تو اُس صورت میں بھی لازم آتا کہ آپ کی اس نبیانہ زندگی کی اتباع میں کوئی نبی بن سکتا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ عطیہ نبوت کے بعد آپ کے مراتب بڑھتے گئے۔ اور آپ کی خدمات نے آپ کو افضل الانبیاء کہلانے کا مستحق کر دیا۔ لیکن وہ اپنے منصب کے لحاظ سے ویسے ہی نبی تھے جیسے نزول نبوت کے دن تھے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ صراط مستقیم سے کوئی ایسا راستہ مراد نہیں جس پر چلکر کوئی نبی بن سکے۔ اِس راستے سے مراد تو وہ راہ ہے جو اُنہیں منصب نبوت کے فرائض ادا کرنے میں اختیار کرنا پڑتا ہے۔ یعنی وہ اخلاق فاضلہ مثلاً استقامت۔ شجاعت۔ طلب حق۔ سرگرمی۔ جد و جہد۔ مخالفین حق کے پیدا کردہ خطرات سے بیباکی۔ وغیرہ وغیرہ (ملاحظہ ہو متن صفحہ ۱۰۴ تا ۱۱۱) کیونکہ اِن اخلاق کے سوا کوئی اس ذمہ داری کے منصب کو تکمیل تک پہنچا نہیں سکتا (بقیہ برصفحہ آئندہ)

بھوک یا پیاس پر ہی ہماری قوت عمل حرکت میں آتی ہے۔ اِس بھوک و پیاس کا نام (یہاں یہ دو لفظ بسیع معنوں میں استعمال کیے گئے ہیں عربی زبان میں شہوت رکھا گیا ہے۔ اور سنسکرت میں لِسے لوبھ کہتے

(بقیہ صفحہ ۱۰۷) یوں تو ہر انسان کی زندگی ایک راستہ ہی ہے جس پر چلکر وہ موت کے دروازے تک پہنچتا ہے۔ لیکن اِس راہ کو اُن اخلاق کے رو سے اچھا یا بُرا راستہ کہا جاتا ہے جو کسی سے اپنی زندگی میں سرزد ہوتے ہیں۔ دنیا میں کامیاب زندگی کے مالک انبیاء علیہم السلام ہوئے ہیں۔ اور وہی اپنے اندر خدا کا رنگ رکھتے تھے۔ اسلیئے ہمیں بھی اُس مقام پر پہنچنے کے لیئے انبیاء علیہم السلام کے اخلاق و آداب کو ہی حاصل کرنا ہے۔ اس قسم کے اخلاق و آداب اُن لوگوں میں بھی نظر آتے ہیں جو قرآنی اصطلاح میں صدیق۔ شہید اور صالحین کہلائے۔ صدیق وہ ہوتا ہے جو اپنے قول و فعل سے ان حقائق کی تصدیق کرے جنہیں اُس نے بطور صداقت قبول کیا ہے اور اخلاق کے سوا۔ اُسمیں وہ استقامت ہو جو اُسے مخالفین صداقت کے پیدا کردہ زلازل کے مقابل قائم رکھے۔ اسی طرح شہید وہ ہوتا ہے جو صداقت مقبولہ کی خاطر اپنی جان و مال کو قربان کرکے اُس قربانی کے ذریعے اُس صداقت کی شہادت دے۔ وہ امر حقہ کی گواہی اپنی جان دے کر دیتا ہے۔ اور صالحین وہ ہوتے ہیں جن میں صداقت پر قائم ہونے سے وہ صلاحیت نفس پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے باعث وہ کسی طمع یا خوف یا بیم و رجا کے مقابل استقامت کو نہیں چھوڑتے۔ اور راہِ صداقت پر قائم رہتے ہیں۔ خود لفظ صراط مستقیم اسی استقامت کی طرف اشارہ کرتا ہے ✦

ہیں۔ اور یہ وہ قوت ہے جو ہمیں حیوانیت سے ورثہ میں ملی ہے اگر انسان کے اندر یہ قوت نہ ہو تو وہ کوئی کام نہیں کرے گا۔ اسی قوت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیئے ہم ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں۔ جس پر ہم سے اچھے یا برے عمل سرزد ہوتے ہیں۔ اگر تو ان تقاضوں کی تسکین میں ہم نے اتلاف حقوق سے پرہیز کیا۔ اور کوئی ایسا فعل نہ کیا کہ جس سے کسی اور کو ہمارے ہاتھ یا زبان سے جسمی۔ جانی۔ مالی آبروئی نقصان پہنچے تو ہمارے افعال قابل ستائش ہو جاتے ہیں اگر ہم تسکین تقاضائے طبعی میں دوسروں کیلئے ضرر رساں واقع ہوئے تو ہمارے کام سب کے سب قابلِ نفرت ہوتے ہیں۔ اول الذکر بات اس وقت ہمیں حاصل ہوگی جب ہمارے قوائے شہوانی ہمارے قابو میں آگئے۔ اور ہمیں اُنپر کامل حکومت حاصل ہو گئی۔ یعنی ہم قوائے شہوانی کی غلامی سے نکل گئے۔ اِس غلامی کا نام عربی زبان میں ضلالت ہے

قوائے شہوانی کے علاوہ خالق فطرت نے ہم میں ایک اور قوت بھی رکھدی ہے۔ اِس قوت کا نام قوت غضبیہ ہے۔ دفع ضرورت کے لیئے یا تسکین جذبات کی جدوجہد میں جو اسباب ہم پیدا کرتے ہیں اگر وہ اسباب غیروں کی دست برد سے محفوظ نہ ہو جائیں تو ہماری سب محنت اکارت جاتی ہے۔ ایسے ہی اسباب مذکورہ بالا کے حصول میں بعض مخالفانہ موانعات بھی ہوتے ہیں۔ جب تک وہ ہماری راہ سے دور نہ ہو جائیں ہم اپنی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ ان

وہ امور کے حصول ہیں ہم سے جو افعال مدافعت میں سرزد ہوتے ہیں وہ قوتِ غضبی ہی سے حرکت میں آتے ہیں۔ لیکن اسی قوت کی بد استعمالی طرح طرح کے جرائم کی شکل میں متشکل بھی ہوجاتی ہے جو انسان قوت غضبیہ پر قابو نہیں پالیتا اور جس حد تک غضب کا غلام ہوتا ہے اسی حد تک وہ معصیتوں میں بڑھتا جاتا ہے۔ اس غضب زدہ انسان کا نام مغضوب آیا ہے۔ اور چونکہ یہ مغضوب اپنے افعالِ غضبیہ سے خدا کے غضب کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اسلیئے وہ مغضوب علیہ کہلاتا ہے۔ یعنی وہ جس پر خدا کا غضب آیا ؛

الغرض طریق سلوک کی تکمیل بلکہ ہر ایک کام میں کامیابی اُسے حاصل ہوتی ہے جو غضب اور شہوت کی حکومت سے آزاد ہوجاتا ہے اسی لیئے خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ دعا سکھلائی :-

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝

ترجمہ (اے خدا) ہمیں غضب زدوں اور گرفتارانِ ضلالت کی راہ سے بچا) ؛

جو ان دو راہوں سے بچا اُسپر صراطِ مستقیم کھل گیا۔ اُسکے ماحول کی ہر ایک چیز اسکے لیئے نعمت ہی نعمت ہوجاتی [illegible] انعام یافتوں کی راہ پر چلنے لگ جائے گا ؛

اس موقع پر یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کل کی کل کائنات میں وہی چیز [illegible] حقہ تک پہنچتی ہے جو ضرر رساں اشیاء سے بچ جائے

اور فطرت نے ہر چیز میں ضرر رساں چیزوں سے بچنے کی قوت طبعاً پیدا کر دی ہے جو جسمانیات میں ایک مشین کی طرح کام کرتی ہے مثلاً باغوں میں ایک ہی ماحول ہوتا ہے۔ ایک ہی قسم کی ہوا ایک ہی قسم کا پانی اور ایک ہی قسم کا موادِ زمین موجود ہوتا ہے جس سے مختلف درخت اپنی اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اپنی شکل اپنے نمو، اپنے پھل پھول میں ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ پھر انکے پھل اپنے خواص میں ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے۔ کہ گو خوراک تو اُنکی ایک ہی ہے۔ لیکن ہر ایک کے لیئے ایک خاص مقدار ہی مفید ہوتی ہے اُس مقدار کی زیادتی اُنکی ہلاکت کا موجب ہو جاتی ہے۔ ہر ایک درخت اپنے ماحول سے اس قدر خوراک لیتا ہے۔ جو اس کے لئے مفید ہو۔ جس قوت کے ماتحت یہ دفع مضرت وحصول منفعت ہو رہا ہے۔ اُسکا نام عربی حکماء نے قوت مدبّرہ رکھا ہے نباتات چھوڑ یہی قوت حیوان و انسان میں جہاں تک جسمانیات کا تعلق ہے طبعاً کام کر رہی ہے۔ انسان کے جسم میں بھی اگر کوئی مضر صحت چیز چلی جائے تو فطرت اُسکو جسم سے نکالکر ہی رہتی ہے لیکن وہی چیز ہے جس کی صحیح مقدار اپنے محل و موقع پر مفید بھی ہو جاتی ہے۔

الغرض خدا کی ہر چیز نعمت ہی نعمت ہے۔ اُسکا مناسب محل و موقع پر استعمال نہ ہونا یا اُسکے مقدار ضروریہ سے تجاوز کرنا قسما قسم کے ضرر کا موجب ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح غضب و شہوت بھی

نعمائے الٰہی میں سے ہیں۔ ان کے صحیح استعمال سے اگر اخلاق فاضلہ و روحانیت پیدا ہو جاتی ہے تو انہی کی بد استعمالی ضال و مغضوب کی جماعت کو وجود میں لے آتی ہے۔ ہاں جب ہم اس استعمالِ بد سے الگ ہو گئے تو پھر یہی ہمارے لئے حسنات کا ذخیرہ پیدا کر دیتی ہیں یہ ظاہر ہے کہ یہ دونوں قوتیں ادراک سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان کے صحیح استعمال کے سمجھنے کا ادراک بروقتِ پیدائش ہم میں موجود نہیں ہوتا۔ نفس مدرکہ کی یہ درستی تو بیرونی علم و ہدایت کو چاہتی ہے۔ قوتِ غضبیہ و شہوانیہ کی تربیتِ صحیح بھی ایک خارجی ہدایت کی متقاضی ہے۔ جس کی روشنی میں ہم ان کے ضرر سے بچ جائیں۔ تقوےٰ اسی بچنے کا نام ہے۔ جو بچا وہی متقی کہلایا۔ لہٰذا متقی بننے کے لئے انسان کو کسی الہامی ہدایت کی ضرورت تھی۔ قرآن کریم ایسی ہدایت کے حامل ہونے کا مدعی ہے۔ اسلئے اس کا نام هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ (بچنے والوں کے لئے ہدایت) آیا

مولداتِ قوائے شہویہ و غضبیہ

بظاہر تو غضب اور شہوت دو لفظ ہی ایسے ہیں کہ ان کے سنتے ہی دل میں ایک قسم کی نفرت و کراہت پیدا ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ اسلام کے سوا اکثر مذاہب نے ایسی تعلیمات دی ہیں کہ جو ان دونوں قوتوں کو

فنا ہی کردیں۔ لیکن کوئی نہیں خیال کرتا کہ یہ تو تیں بھی خدائے قدوس وحکیم کی ہی پیدا کردہ ہیں۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ دونوں جذبات اپنی طبعی حالت میں ضرر رساں ہی نظر آتے ہیں۔ لیکن کائنات کی بہت سی چیزیں جو ہماری زیب وزینت ہوجاتی ہیں اپنی ابتدائی شکل میں نہایت ہی ناہموار وناخوشگوار ہی واقع ہوئی ہیں۔ وہ کنکر اور سنگ ریزے ہی ہوتے ہیں جو آگ میں پڑکر اور پھر پس پسا کر مرمری چونہ بن جاتے اور جن سے عمارات کی زینت ومضبوطی ہوجاتی ہے۔ سونا۔ چاندی یا اور بیش قیمت دھاتیں یا پتھر اپنی پہلی شکل میں چٹانی کنکر ہوتے ہیں۔ ہماری محنت ہی اُنہیں کچھ کا کچھ بنادیتی ہے۔ ہوبہو یہی نقشہ ان اخلاقی اور روحانی سنگ ریزوں کا ہے۔ جو اپنی ناتراشیدہ حالت میں غضب وشہوت کہلاتے ہیں +

ظلم وستم اگر غصے کی ایک شکل ہے تو عدالت وشجاعت بھی اسی کی دوسری شکل ہے۔ اگر کسی بےکس ناکردہ گناہ کی ایذا رسانی میں غضب جور وجفا کی شکل اختیار کرلیتا ہے تو پھر ظالم کی سزادہی میں غضب ہی کا نام عدالت ہے۔ ایک خونخوار ظالم کے ہاتھ سے مظلوموں کو بچانے کے لئے غضبی طاقت جو جرأت پیدا کردیتی ہے۔ وہ شجاعت کہلاتی ہے +

اگر بدکاری وسیہ کاری شہوت کی منہ زوریوں سے ہی پیدا ہوتی ہے تو یہی قوت منزہ ومطہر ہوکر پاک محبت بن جاتی ہے

جس کی آخری شکل عشق الٰہی ہے۔ حرص و لالچ اگر اسی کی ایک شکل مکروہ
ہے تو سخاوت بخشش بھی اسی طبعی جذبہ کی ایک پسندیدہ صورت ہے
الغرض رحمت شفقت مروت و احسان سب اسی سے پیدا ہوتے ہیں
پھر غضب اور شہوت یا اُنکے مولدات ایک دوسرے کی آمیزش
میں طرح طرح کے اچھے یا بُرے اخلاق پیدا کر دیتے ہیں۔ غیرت اگر غضب و
محبّت کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے تو غصے کی کمی اور دوسرے کی خاطر
بیجا جس کی بنا لالچ ہو یا کچھ اور، دیوثی کو پیدا کر دیتی ہے۔ ایسا ہی
اگر کسی کی تادیب و اصلاح کے لیئے ہم غضبناک ہو جاتے ہیں
تو اسکی تہ میں محبت و شفقت ہوتی ہے۔ در اصل یہ محبت
ہی کے کرشمے ہیں جس سے نسل انسانی کی کل کی کل صلاحیت
امن اور ترقی وابستہ ہے اور اسکے نتائج کی حفاظت کے لیئے
قوتِ غضبی کی ضرورت ہی۔ خود خدائے تعالیٰ نے جن صفات
میں ہم پر ظاہر ہونا چاہا وہ سب کی سب محبت و شفقت کی ہی
شکلیں ہیں۔ چنانچہ اُسکی رحمت اسکے غضب پر غالب آئی ہے
اور اُس کا غضب بھی چونکہ تادیب و تہذیب مخلوق کے لیئے
ہوتا ہے۔ اسمیں عنصر غالب بھی محبت الٰہی ہے۔ قرآن کریم نے جو
ننانوے اخلاق باری گنے۔ اور اُنکی اُم الصفات رب۔ رحمٰن
رحیم اور مالک کو ٹھیرایا۔ اِن صفات ربی میں بھی شفقت و رحمت
ہی نظر آتی ہے۔ ربوبیت۔ رحمانیت۔ رحیمیت تو محبت ہی محبت ہے

ہاں مالکیت کے ایک عنصر کو ضرور سزا و عذاب سے تعلق ہے۔ لیکن وہ بھی تو اصلاحاً ہی ظہور میں آتا ہے۔ الغرض خدا محبت ہی۔ اسی کی طرف کُنتُ کَنزًا کی حدیث اشارہ کرتی ہے۔ یعنی خدا ایک خزانہ مخفی تھا اُسکی محبت نے ظہور میں آکر کائنات کو پیدا کر دیا۔

قرآن کریم کا یہ بڑا کمال ہی کہ اُسنے تہذیب و صلاح خلق کے لیے سب سے اول اخلاق کی جڑ یعنی غضب و شہوت کو پیش نظر رکھکر اِن کی تعدیل و تطہیر کی راہ بتلائے۔ پھر اِن دو قوتوں کی موٹی موٹی مکروہ صورتوں کا بھی ذکر کر دیا۔ جن سے بچنے پر انسان ہر چھوٹے بڑے گناہ سے نجات پا لیتا ہے۔ ایسا ہی اِن طبعی جذبات کی شکل محمود کو بھی بیان کر دیا۔ جن کا نام اخلاقِ فاضلہ ہے۔ اور اُن امور کی بھی بالتفصیل ہدایت کر دی جن پر چلنے سے انسان میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں اِن امور کو جس طرح خدا کی آخری کتاب نے بیان کیا وہ قرآن ہی کا حصہ تھا یہ باتیں شرح و بسط کے ساتھ مجھے اور کہیں نظر نہیں آئیں۔ اِن امور کی تشریح و توضیح ایک ضخیم تصنیف کو چاہتی ہے۔ اگر خدائے برتر نے توفیق دی اور زندگی کے کچھ دن اور عطا کیئے تو اِس کتاب کی تالیف میرا فرض اولین ہو گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

یہاں میں اُن چند اخلاقِ مذمومہ و حسنہ کو مختصراً لکھ دیتا ہوں جن میں شہوت و غضب متشکل ہو جاتے ہیں۔ اِن میں سے اوّل الذکر مغضوب و ضال لوگوں خط و خال ہیں اور آخر الذکر انعام یافتہ گروہ

کے خصائص میں سے ہیں۔

غضب و شہوت کی مکروہ شکلیں

بغض، کینہ، حسد، تکبر، غرور، فخر، شیخی، نکتہ چینی، عیب بینی، اتہام افترا پردازی، بیباکی، خشونت مزاجی، بدسلوکی، تہور، ظلم، ایذا رسانی، بدانتقامی، بدزبانی، سخت گوئی، بے حیائی، اباہت، گستاخی، ناشکرگزاری غیبت، سستی، غفلت، تن آسانی، پست ہمتی، نفسانیت، کمینگی، بغاوت، تملق، ریا، دروغگوئی، بدطینتی، حرص، طمع، بخل، تنگ دلی، خیانت، خوشامد، بے غیرتی، دیوثی، بدنظری، زناکاری، بزدلی، حماقت، بے صبری، چغلخوری وغیرہ وغیرہ

غضب و شہوت کی محمود شکلیں

شجاعت، عدالت، انتقام عزت، عزم، عالی ہمتی، استقامت، استقلال صدق، اخلاص، راست گوئی، شکرگزاری، حقیقی مدح، شیریں بیانی، ملاطفت، ملائمت، اعترافِ حسنات، حقوق شناسی، غیرت، طہارت عصمت، عفت، رحمت، شفقت، نرم مزاجی، ہمدردی، نیک نیتی، سخاوت، بخشش، وسعت قلبی۔ شرح صدر۔ ایثار، نفس کشی، سیر چشمی، دیانت، رشک، جفاکشی، چستی، صبر، قناعت، رضا، تسلیم، توکل، حلم، انکسار، تحمل، عفو، پردہ پوشی، علو نفس، خودغرقی،

خود ضبطی، حکمت۔ فطانت، خدا ترسی، ظلم و باطل کے مقابل میں بے خوفی، حفظ مراتب، پرہیز گاری وغیرہ وغیرہ۔

یہ دو اساسی جذبات (غضب و شہوت) اپنی ارتقائے بالا میں جس بات کے محتاج ہیں۔ وہ حکمت و عقل ہے۔ اور اسکی حقیقی تربیت الہام الٰہی ہی کرتا ہے۔ ہدایت ربی سے ہی یہ دو قوتیں بدی کی بجائے نیکی ہو جاتی ہیں۔ الغرض ہمارے کل کاروبار ہماری کامیابی یا ناکامی ہماری فلاح و بربادی سب کے سب اُن اطوار و اخلاق سے وابستہ ہیں جن میں شہوت و غضب نے ہدایت یا عدم ہدایت کے ماتحت ایک ایک صورت اختیار کر لینی ہے۔ اسی لیئے سورۂ فاتحہ نے جو دعا سکھلائی وہ بھی یہی ہے کہ اے خدا ہمیں انعام یافتوں کی راہ دکھلا اور ضال و مغضوب کی راہ سے بچا۔ یعنی مذکورہ بالا فہرست میں سے آخر الذکر اخلاق سے ہمیں متصف کر اور اول الذکر باتوں سے ہمیں محفوظ رکھ۔

سورۂ فاتحہ کی جامعیت اور اسپر اُسکے اختصار کو دیکھکر نہ صرف میری حیرت کی کوئی حد نہیں رہتی بلکہ بے اختیار میرے مُنہ سے نکلتا ہے کہ یہ تو خدا کا کلام ہے۔ کیونکہ انسان کی علم و عقل اسقدر جامع اور محیط واقع نہیں ہوئی۔ آخر دنیا میں اور بھی الہامی دعائیں دیکھی ہیں۔ لیکن سورۂ فاتحہ کی وسعت تو نہ صرف ہماری ہر ایسی دُعا و تمنا کے اصول کامیابی پر حاوی ہے جو ہر ضرورت انسانی پر ہمارے دل سے نکلتی ہے بلکہ یہ تو ہر کامیابی کی کلید سربستہ ہے۔ پھر انسان

کے ہر امر میں فاتحہ کا پیش کردہ نصب العین کسقدر بلند ہے یعنی جو کام بھی ہم کریں وہ ربانی رنگ میں کریں۔ روحانیت واخلاق کا حصول تو ایک مقصدِ عظمےٰ تھا۔ لیکن معاشرت ومعاشی امور میں بھی جو کاروبار ہم کریں۔ اُن میں بھی خدا کا ہی رنگ ہو۔ مثلاً ہر امر مہمہ کے سرانجام میں قبل از وقت ہم ہر پہلو کو سوچ لیں۔ ہر امکانی نقصان کی روک کا فکر کریں۔ کام کے شروع کرنے سے پہلے پورے طور پر اسکے متعلق تدبیر، تنظیم، تنسیق اور ایسا ہی تہیۂ اسباب ضرورۃ کرلیں۔ اور یہ اسلیئے کہ ہمارا رب جو کام کرتا ہے۔ اِسی انداز پر کرتا ہے ایسا ہی ہر کام میں ہماری جدوجہد کا وہ رنگ ہونا چاہیئے جسکی طرف لفظ عبادت اشارہ کرتا ہے۔ یعنی کام کرتے کرتے ہم اپنے آپ کو پیس ہی ڈالیں۔ پھر اِس جدوجہد میں فلاں فلاں اخلاق اختیار کریں۔ اور فلاں فلاں باتوں سے بچیں۔ اور اِس کام کے لیئے جس ہدایت کی ہمیں ضرورت ہو اُسکے لیئے دعا مانگیں۔ اللھم صل علےٰ سیدنا محمد وعلی اٰل سیدنا محمد ؐ ٭

جو لوگ دعا کی تاثیر سے مایوس ہو چکے ہیں یا جو لوگ دعا کو اپاہج بننے کا ایک موجب قرار دیتے ہیں وہ آخر کی اِن چند سطروں پر غور کریں۔ جن پر میں نے اِن اوراق کا خاتمہ کیا ہے۔ وہ غور کریں کہ خدائے قرآن نے اپنے ہاں پہنچنے کی کونسی راہیں رکھی ہیں یا کسی کام میں میں کامیابی کے لیئے وہ کونسی دعا سنتا ہے۔ ساری سورۂ فاتحہ

میں دعائیہ فقرہ تو صرف ایک ہی۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ یعنی ہمیں راہ مستقیم دکھلا۔ چلنا تو ہم نے ہی ہے۔ ہاں کسی غلط رستے پر ہم نہ چلے جائیں۔ اور راستہ بھی وہ چلیں جسکے کل سائن بورڈ اخلاقِ حسنہ ہی ہیں۔ یہ دعا کسی مطلوبہ چیز کے حصول کے لیئے بھی نہیں بلکہ اُسکے حصول کی راہ پوچھی گئی ہے۔ پھر جس جدوجہد کو ہم نے کرنا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ کہلوا کر اُسکا اعتراف بھی ہم سے کروالیا ہے یعنی ہدایت طلبی سے پہلے ہم اعتراف کر لیتے ہیں کہ ہم اپنی جدوجہد میں پس مرنے کو تیار ہیں۔ پھر ان سب سے پہلے اسمائے ربانی کا تکرار کر کے تین چار باتوں کو ہم تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔ اول ہم ہر قسم کی تدبیر و انتظام کرینگے دوئم۔ ہمارے کاروبار کے لیئے مواد موجود ہیں جسے ہم استعمال کرینگے۔ سوئم۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ ہماری محنت ضائع نہ جائے گی اور صحیح راہ پر چلنے سے ہماری محنت کا ثمرہ کئی گنا ہوگا۔ ہم یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ بلا محنت ہمیں کچھ بھی نہ ملیگا۔ چہارم اگر ہم نے غلط راہ اختیار کی تو ہمیں سزا بھی ملجائے گی +

اِس اعتراف و تسلیم کے بعد اور پھر اس قسم کی جدوجہد و ہدایت طلبی کے ساتھ کیا کوئی ناکامی کا مُنہ دیکھ سکتا ہے؟ کیا اُسکی کوئی دعا ضائع جا سکتی ہے؟ اور کیا یہ دعا اُسے اپاہج و بیکار بنا سکتی ہے؟ فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ+ مسلم بھائی ان الفاظ پر غور کریں۔ اور اپنی موجودہ ناکامی و فلاکت کے وجوہ دیکھ لیں +

خواجہ کمال الدین

خط و کتابت

نقل چٹھی لالہ جیون لعل صاحب

مکرم مولانا محمد علی صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی احمدیہ بلڈنگز لاہور

تسلیم۔ عرصہ ہوا جبکہ آپنے انگریزی ترجمہ قرآن مجید شائع فرمایا تو نہایت شوق سے ایک جلد میں نے خرید کی۔ اور گاہے بگاہے پڑھکر آپ کی محنت اور جانفشانی کی داد دینی پڑتی ہے۔ حال ہی میں مجھے آپکے اردو ترجمہ کے پہلے پارے کے ملاحظہ کا شرف حاصل ہوا۔ سبحان اللہ آپ کتنا بڑا کام اور احسان فرما رہے ہیں۔ جب میں ان تراجم کو پڑھتا ہوں جس میں آجکل دنیا بھر کی مذہبی کتب ایک دوسری زبان میں شائع ہو رہی ہیں تو مجھے ایک خیال بڑے زور سے پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ کیا اب ضروری ہے کہ سندھیا، نماز اور عبادت، غرضیکہ جو کچھ بھی دنیا میں مذہب کے نام سے چلا آرہا ہے اسی زبان میں ہو جس میں کہ الہامی کتابیں نازل ہوئیں۔ میں آریہ، ہندو اور مسلمان بھائیوں کو عام طور پر دیکھتا ہوں کہ سنو میں سے مشکل سے دو چار جانتے ہیں جو وہ بوقت نماز اور سندھیا اپنی مذہبی زبان عربی اور سنسکرت میں کرتے ہیں۔ اور یہی ایک وجہ ہے کہ عموماً سندھیا اور نماز ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ نہیں ہے۔ میرا یقین واثق ہے کہ جو لطف اور کمال انسانی پر پہنچنے کا ان لوگوں کو حاصل ہو جن کی مادری زبان عربی یا سنسکرت ہی۔ وہ ہم پنجابیوں کو نہیں۔ ہمارے بہت سے بھائی سندھیا سنسکرت میں اور نماز عربی میں

ادا کرتے ہیں۔ لیکن دل سے نہیں جانتے کہ انہوں نے کیا کیا اور کیا دعا کی۔
معاف فرماویں میں تو بعض لوگوں کو فونوگراف کے ریکارڈ کی طرح سمجھتا ہوں اور
مجھے بڑی ہمدردی ہوتی ہے اور چاہتا ہوں کہ کاش یہ لوگ جو کچھ عربی یا سنسکرت
میں بوقت سندھیا اور نماز خداوند دو جہان کے حضور میں عرض کر رہے ہیں
اُس سے وہ واقف ہوں۔ اور اس کہی ہوئی نماز اور سندھیا کے پابند ہوں
اگر ایسا ہو جائے تو آج دنیا بہشت یا سورگ ہو سکتی ہے اور نہایت اعلیٰ شانتی
کی زندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ نظیر کے طور پر سورۂ فاتحہ کے متعلق عرض ہے
کہ یہ وہ سورۃ ہے جو اُمّ الکتاب ہے اور جس کا ورد کم از کم بتیس دفعہ ۲۴ گھنٹے میں کرنا
بیان کیا جاتا ہے۔ آپنے اس کا ترجمہ یوں فرمایا ہے۔ "اللہ بے انتہا رحم والے بار
بار رحم کرنے والے کا نام سے۔ سب تعریف اللہ کے لیئے ہی جو (تمام) جہانوں کا رب ہے
بے انتہا رحم والا بار بار رحم کرنے والا۔ جزا کے دن کا مالک۔ ہم تیری ہی عبادت
کرتے ہیں اور تجھی سے اعانت چاہتے ہیں۔ تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔ اُن لوگوں کے
رستے جن پر تو نے انعام کیا نہ اُن پر جن پر غضب ہوا۔ اور نہ گمراہوں کا۔"
(یہاں لالہ صاحب نے اسکا انگریزی ترجمہ دیا ہے جو چھوڑ اگیا)
آپنے فرمایا کہ سوائے اسلام کے جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں وہ تمام موجودہ
حالت میں صرف ایک خاص شاخ اخلاق انسانی پر ہی سارا زور دیتے ہیں۔
اسلیئے ان میں افراط و تفریط کی غلطیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ ایک اور جگہ آپنے فرمایا:
کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا سکھلانے میں اور کمال انسانی تک پہنچانے میں
اسکی زنجیر نہ توریت میں ملتی ہے اور نہ انجیل میں۔ اور مذہب تو صرف معانی کے

سکھلانے تک محدود رہ جاتے ہیں۔ اور اسلام نہ صرف گناہوں سے بچنے بلکہ لغزشوں سے محفوظ رہنے اور یوں مقام عصمت یا معصومیت پر پہنچنے کی دعا سکھلاتا ہے بلکہ خود قرآن شریف کی دعاؤں میں یہ دعا سب سے افضل ہے اور پھر آپنے فرمایا کہ :۔ پس معلوم ہوا کہ یہ دعا۔ روپیہ، مال اور مرتبہ کے لیئے نہیں۔ کمالاتِ معرفت و محبت کے حصول کے لیئے ہے۔ سبحان اللہ آپنے ان ہر سہ مقامات میں کیا کمال دکھایا ہے۔ کاش کہ عام لوگ اِسے سمجھیں۔ اور اِس دعا کو اپنی روزانہ زندگی میں برتیں۔

جناب حضرت صاحب۔ آپنے لفظ تو مذاہب کا اوپر استعمال فرمایا ہے لیکن تورات اور انجیل ہی میں تمام دنیا کے مذاہب ختم فرما دیئے۔ سینٹ پیٹر میں سینٹ جیمس میں آتا ہے :۔

"If any one or you taste wisdom let him ask of God, that giveth to all men liberally and upbraideth not, and it shall be given to him. God resisteth the proud and giveth grace to the humble."

دربار صاحب جو سکھ صاجان کی گورو بانی ہے۔ اُس میں آتا ہے :۔

دھرگ تناں جیونا ــ جے لکھ لکھ ویچنڑ ناؤں
کھیتی جنکی اُجڑے ــ کھلواڑے کیا تھاؤں

سچ سرنے باہرے آگے لیڈ نہ داد — عقل رہبر نہ آکھیئے عقل گنوائے باد
عقل صاحب سویئے عقل پایئے مان — عقل بڑھ کے لیجیئے عقل کیجیئے دان
نانک آکھو راہ ریہہ ہور گلاں شیطان

دو ارب برس کے قریب عرصہ گزر رہا ہے کہ ویدوں میں کئی ایک جگہ ذیل کا منتر ہے جس سے آریہ، ہندو، سب لوگ اسی طرح دعا مانگتے ہیں جس طرح کہ مسلمان جیان:

دیو ـــ ایشور کے لیۓ استتی جگت کا مالک۔

بھویش ٹھانتے وشوانی دیونانی وددان ـــ سب کرموں کو جاننے والا۔

اسلیئے نیاسۓ کے دن کا نیاۓ دِھش (مالک)

بھویش ٹھانتے نم اکتم ودھیم ـــ ہم اسکو نمن کرتے ہیں اور اسکی ہی سہاہتا چاہتے ہیں۔

سُپتھانتے بھٹانۓ اسمان ـــ سمارگ (سیدھے رستے) سے ہمیں لے جاؤ۔

راتسے نۓ اسمان ـــ اُن کا مارگ کہ جنپر تمہاری کرپا (انعام یا مہربانی) ہے

اینہ یو یودھی ـــ اُن کا مارگ نہیں جن پر تمہارا کرودھ (غضب) ہے۔

جوہرا اُنم یو یودھی ـــ اور نہ اُن کا جو ٹیڑھے مارگ (رستہ) سے چلتے ہیں۔

"O All-wise Being! Thou art the souree of Knowledge. Inspire us with Thy Wisdom, lead us to rectitude, drive off our evil. To this and we repeatedly praise Thee and adore."

(P. Guru Datta M. A.)

"O God of Agni, knowing all things that are manifested, lead us by the good path to the falicity; remove from us the devious attraction of sin. To the completest speech of submission we will dispose."
(Sri Aurobinda Ghosh.)

میں نے آپ کی اطلاع کے لیے اس منتر کا ترجمہ اُردو اور انگریزی زبانوں میں جیسا جیسا کہ نامی عالموں نے کیا ہے۔ اُنکے نام دے کر لکھدیا ہے۔ غور کرنے پر واضح ہوگا کہ اربوں برس آریہ و ہندو لوگ یہ منتر مندرجۂ بالا کے ذریعے اور پادری لوگ انجیل کے ذریعے اور اسلام سورۃ فاتحہ کے ذریعے اور سکھ صاحبان اپنے دربار کے ذریعے اُس سب کے مشترکہ مالکِ خداوند کائنات سے یہی دعا مانگتے ہیں کہ خداوند کریم عقل سلیم عطا فرمائے تاکہ سیدھے راستے پر ہم سب لوگ چلیں۔ لیکن عملی طور پر کیا ہو رہا ہے کہ آریہ و ہندو تو سنسکرت میں اُچارن کرتے ہیں الّا نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ پادری صاحب کی انجیل میں بھی یہی دعا ہے جو اسلام اور سکھ مت میں موجود ہے۔ گھاٹا اگر ہے تو اس بات میں کہ اُچارن کرنے والے یا بولنے والے پنجابی کی۔ مادری زبان نہ سنسکرت ہے اور نہ انگریزی یا عربی۔ بلکہ اپنی موجودہ گری ہوئی حالت میں ٹھیٹھ پنجابی بھی نہیں۔ حضرت مولانا صاحب کیا آپ میرے ساتھ اس بات میں اتفاق فرمائینگے کہ اگر مندرجہ بالا مذاہب جیسا کہ علیحدہ علیحدہ اُن کی آسمانی کتاب میں درج ہے۔ پنجاب بھر میں پنجابی زبان میں خاص الفاظ مقرر

کر کے یہی دعا پڑھیں تو کتنا فرق پڑ جائے گا۔ میرا تو یقین ہے کہ اگر ایسا ہو جائے۔ اور ہم سب ایسی پرمیشر، پرماتما۔ خدا، اللہ، رب اور واہیگرو سے پنجابی میں یکزبان ہو کر دل سے اگر آج دعا کریں تو یہ دنیا سورگ، بہشت اور مکتی کی جگہ بن سکتی ہے۔ ورنہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ دیکھتے چلے آتے ہیں۔ اور اسی طرح دیکھتے چلے جائیں گے +

جواب کا منتظر اور آپکا ادنیٰ مداح۔ جیون لعل

نقل جواب چٹھی از مولوی عبدالحق صاحب

مکرم بابو صاحب، بعد ماوجب گزارش ہے۔ کہ

آپ کا خط حضرت امیر ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ کے نام پہنچا۔ آپکے جواب میں حضرت امیر لکھواتے ہیں کہ عربی زبان کی تحصیل ہر مسلمان کے لیئے چونکہ لازمی ہے اس لیئے قرآن کریم اور شریعت اسلامیہ نماز وغیرہ کی قرأت کو عربی میں ہی جائز رکھا ہے۔ ہاں دعا کے وقت اس منصوصہ دعا کے علاوہ اپنی زبان میں بھی دعا کی جا سکتی ہے۔ نماز اور تلاوت قرآن کو عربی میں رکھنے سے غرض یہ ہے کہ اسلام چونکہ ایک عالمگیر مذہب ہے اور اسکے حلقہ بگوش دنیا کے ہر ایک حصہ میں پائے جاتے ہیں اور تمام دنیا کے مسلمانوں میں اخوت کو قائم رکھنے کے لیئے زبان عربی کی تحصیل کو لازمی قرار دیا ہے۔ ہاں اگر اسلام صرف پنجاب کا ہی مذہب ہوتا جیسا کہ ویدوں کا مذہب صرف آریہ ورت کے لیئے ہی ہے تو ملک کی زبان کے تغیر کے ساتھ مذہبی عبادات کو بھی مروجہ زبان میں ہی ادا کرنا ضروری ہوتا جیسا کہ انجیل سے عملاً کیا ہے۔ شریعت

اسلامی کی حدبندی کا ہی یہ اثر ہے کہ گو کل کے کل مسلمان تو نہیں مگر اکثر مسلمان نماز کے مطالب اور معانی کو سمجھتے ہیں۔ اگر کسی جگہ کے مسلمان کثرت سے نماز کے مطلب کو نہیں سمجھتے تو یہ علما کا قصور ہے۔ کیوں کہ اُن کے ذمہ یہ فرض ہے کہ وہ عوام کو اُن ضروری باتوں کی تعلیم دیں۔ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے کہ جس کے بانی نے اسکو ملکی حدود میں محدود نہیں کیا اور نہ اس مذہب کو کسی خاص ملک یا قوم کا مذہب قرار دیا ہے +

اگر وہ پنجابیوں کو صرف زبان پنجابی میں نماز اور قرآن پڑھنے کی اجازت دیدے تو اہل چین کو چینی زبان میں پڑھنے کی اجازت رہنی چاہیئے۔ اور اس طرح سے ہر ایک ملک کا اسلام ایک نیا اسلام ہوگا اور یوں اس عالمگیر مذہب کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور کوئی اخوت باہم قائم نہ رہ سکے گی۔ ہاں عیسائیت چونکہ ان کے بانی کے نزدیک صرف بنی اسرائیل کے لیے ہی ہے اور ویدک دھرم صرف آریہ ورت کے لیے ہے لیئے اسکو ملکی زبانوں میں محدود کیا جا سکتا ہے +

یہاں تک تو حضرت امیر کے ارشاد کے مطابق آپکے سوال کا جواب دیا ہے۔ اب میں اپنے طور پر آپکے پیش کردہ منتر اور گرنتھ کے اشلوک کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ آپ کا خط حضرت امیر نے مجھے جواب کے لیئے بھیجدیا تھا مگر میں اپنی کم فرصتی اور لاہور سے طویل غیر حاضری کے باعث جلد جواب نہ لکھ سکا۔ آج آپ کا کارڈ ملا تو جواب لکھتا ہوں۔

گرنتھ صاحب اور خدا رسیدہ بزرگوں والی کتاب ہے جو آپنے سورۃ فاتحہ

کی مثل دعا پیش کی ہے۔ افسوس ہے کہ مجھے اِس میں آپ سے اتفاق رائے نہیں گرنتھ صاحب کے اشلوک میں تو سورۃ فاتحہ کی دعا کی مثل کوئی بات ہی ہی نہیں۔ اور اگر ہو بھی تو یہ کتاب قرآن مجید کے بعد کی ہے۔ اور جس طرح قرآن کریم کی بہت سی آیات کا ترجمہ گرنتھ صاحب میں حضرت بابا نانک صاحب علیہ الرحمۃ نے کیا ہے اسی طرح اس مضمون پر سردار نتھا سنگھ صاحب نے "دُریاء وحدت" میں بہت کچھ لکھ دیا ہے۔ اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ گرنتھ صاحب کا بہت سا حصہ قرآن کریم کی آیات کا لفظی ترجمہ ہے۔ اور بابا نانک کا قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ اس مضمون پر حضرت مرزا صاحب کی کتاب "ست بچن" اور "ایڈیٹر نور" قادیان کی کتب میں بہت کچھ بحث ہو چکی ہے۔

وید منتر جو آپ نے پیش کیا ہے اُسکو بیسویں صدی کی عینک لگا کر پڑھا گیا ہے۔ اور سائین بھاش سے مشورہ کر لیا جاتا تو آپ کو اس منتر کی اور اسکے اگلے پچھلے منتروں کی تعلیم کا آسانی سے پتہ لگ جاتا کہ یہ منتر کس موقع پر پڑھے جاتے ہیں اور ان کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔

ان تینوں ترجموں میں سے جو آپ نے اس منتر کے پیش کیے ہیں اردو ترجمہ کو تو منتر سے کوئی تعلق نہیں۔ جیسا کہ میں آگے چلکر بیان کروں گا پنڈت گرودت جی کا ترجمہ سوامی دیانند جی کے نو ایجاد طرزِ تفسیر کا محض نمونہ ہے۔ البتہ شری آربند گوش کا ترجمہ منتر کے مطلب کے کسیقدر قریب ہے۔ اور اس ترجمہ کی بنا پر اسکو سورۃ فاتحہ کے مثل کہنا قطعاً غلط ہے۔

لفظ دیو کے معنے "ایشور کے لیئے استتی (تعریف جگت کا مالک") دیاکرن (سنسکرت گرامر) اور لغت ان معنوں کی متحمل نہیں۔ "وشوانی۔ ویدنانی وودانی کے معنے" سب کرموں کو جاننے والا۔ اسلیئے نیائے کے دن کا نیائے دِھش (مالک) محض مالکِ یومِ الدین کو مدنظر رکھکر ترجمہ کیا گیا ہے۔ منتر کے الفاظ میں "نیائے" اور نیائے دھش" کے مفہوم کو ظاہر کرنے والے کوئی الفاظ نہیں۔ اور نہ سب کرموں کو جاننے والے کو ظاہر کرنیکے لیئے کوئی الفاظ ہیں ؛

ستیتھان نے اسماں میں سوتیھا کو صراط مستقیم کا مترادف قرار دینا کسی صورت میں درست نہیں۔ کیونکہ اسی سوتیھا کی تفسیر لفظ رائے میں موجود ہے۔ یعنی دولت کے لیئے لفظ "رِیی" کے معنے کرپا یا انعام روحانی کے ہرگز نہیں۔ بلکہ صرف دولت دنیائے ہیں۔ اور اس لفظ سے لفظ رئیس بنا ہے کہ جو کبھی انعام یافتہ یا منعم علیہ لوگوں پر استعمال نہیں ہوتا۔ بلکہ معمولی دولتمندوں پر ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ آپ سورۃ فاتحہ کو اعلیٰ درجہ کی سورۃ سمجھتے ہیں۔ اور منتر کو اسکے مطابق ڈھالتے ہیں۔ مگر سوامی دیانند جی اِسکو ویدک تعلیم کے خلاف سمجھ کر اسپر ستیارتھ پرکاش میں کئی ایک اعتراض کرتے ہیں۔ (دیکھو صفحات ۲۰۹ ستیارتھ پرکاش) ؛

آپکا مخلص عبدالحق ایڈیٹر پیغام صلح

"خلاصہ"

نہ تو میں ان مختلف اعتراضات اور جو ہرلال صاحب کی جنہیں دیکھ گئی ہیں

کوئی متقابلانہ رائے دینا پسند کرتا ہوں نہ پنڈت عبدالحق صاحب ودیارتھی کی تنقید پر کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جس رنگ اور جس معنی میں یہ دعائیں لی جائیں یہ ایک عاجز اور مضطرب روح کی صدائیں ہیں اور اِس اضطراب و عجز کے سوا کوئی دعا بھی خدا کی جناب میں پیش کرنے کے قابل نہیں ہوتی۔ البتہ سورۂ فاتحہ اپنی نوعیت میں سب سے جدا ہے انسان اگر کسی چیز کا محتاج ہے تو صحیح علم کا۔ یا جدوجہد زندگی میں خواہ وہ اُس کی معمولی ضروریات زندگی سے تعلق رکھے یا اس کے ذہنی و روحانی مقتضیات ہوں وہ سب میں ایک سچے راہ پر قدم زن ہونے کے لیئے محتاج ہدایت ہے۔ جس نے وہ راہ پالی وہ ہر زاویہ نگاہ سے اور ہر پہلو سے خزائن کا مالک ہوگیا۔ اسی ضرورت کو سورۂ فاتحہ نے مہیا کیا۔ اُس نے اُسی راہ کی ہدایت کی دعا سکھلائی۔ جس پر چلکر لوگ کامیاب (انعام یافتہ) ہوگئے۔ اور ناکامی سے بچ گئے۔ پھر ساتھ ہی بین طریق پر اُن باتوں کو بتلادیا۔ یعنی اخلاق حسنہ و ذمیمہ کو جو اس کامیابی و ناکامی کا موجب ہو جاتے ہیں۔ گو اخلاق و نفسیات ایک نہایت ہی دقیق مضمون ہے جو عامہ فہم سے بہت بالاتر ہے لیکن دو لفظ مغضوب اور ضال بولکر ایک عامی انسان کو بھی اور ایک باریک فہم والے کو بھی واضح کردیا کہ جو غصہ اور ضلالت کا شکار نہ ہوا وہی انعام پاگیا۔ ساتھ ہی ایاک نعبد، کہکر ہم پر یہ بھی ظاہر کردیا کہ کامیابی اسی کو نصیب ہوتی ہے جو اپنی جدوجہد میں پس مرنے کو تیار

ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑھ کر ہمارے سامنے اسمائے حسنہ رکھ کر
وہ بلند سے بلند نصب العین رکھ دیا۔ جس سے آگے فہم و وہم انسان
بھی جانے سے قاصر ہے۔

یہ دعا نہ روپے پیسے کے لیئے ہے۔ نہ دنیوی اغراض کے حصول
کے لیئے۔ حالانکہ اس کے مفہوم پر چلنے والا ان سب باتوں کو پالیتا
ہے۔ یہ دعا تو حصول علم و عرفان کے لیئے ہے۔ اور انسان اسی لیئے پیدا
ہوا ہے۔ پھر اس امر میں بھی عمومیت کا رنگ نہیں۔ نہ کوئی ابہام ایہام
ہے بلکہ بیّن سے بیّن الفاظ میں اس دائرہ عرفان کو محدود کر دیا
جس میں ہمارے اعمال نے حرکت کرنی ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے
کہ یہ دائرہ باوجود محدود ہونے کے اپنی وسعت میں ہر ضرورت
انسانی پر حاوی ہو جاتا ہے۔ عفوِ معصیت بھی ایک بہترین مضمون
دعا ہے۔ لیکن سورۂ فاتحہ نے اسکے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا ہے
کہ کن راہوں سے بچکر انسان پنجہ گناہ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وَمَا
تَوْفِیْقِیْٓ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

جو کچھ بھی لالہ صاحب نے دعاؤں کے مادری زبان میں مانگے
جانے کے متعلق کہا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ اور یہ غرض ہم پوری
کرتے ہیں۔ اور اس کی ہمیں ہدایت بھی ہے۔ لیکن جن مطالب عالی
کو سورۃ فاتحہ اپنے اندر لیئے ہوتے ہے۔ اور جن مختصر سے مختصر
الفاظ میں دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔ وہ غرض تو سورۂ

فاتحہ کے ترجمہ کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ دوسری زبانوں کے الفاظ ایسے جامع اور وسیع واقع نہیں ہوئے۔ رہا ان الہامی الفاظ کے معانی سے واقف ہونا سو وہ ہر مسلم کا فرض ہے۔ اور ان معانی پر قادر ہو جانا ایک آسان سے آسان کام ہے +

پرتاب فارم سرینگر
(کشمیر)

خواجہ کمال الدین



ضرور پڑھیں:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ضرور پڑھیں !!

مُسلم مِشن وُوکنگ
اور
اُس کا استحکام

یہ مشن اب نہ کسی تعارف کا محتاج ہے نہ اسکی ضرورت و اہمیت پر کسی بحث کی ضرورت ہے۔ اگر یہ مشن اب تک کامل نتائج پیدا نہیں کر سکا تو اس کا باعث کوئی ہمارے نقص ہیں اور زیادہ تر اُس جدوجہد کی کمی ہے جو قومی توجہ اور تعاون سے ہی پیدا ہوسکتی ہے۔

یہ امر اب ثابت ہوچکا ہے کہ یہ مشن ایک ضرورت حقہ ہے اور اگر اسکے استحکام کا انتظام ہوجائے تو عنقریب مغرب میں مذہبی تبدیلی کا باعث ہو کر یہی مشن اسلام کی قوت اور شوکت کا باعث ہوسکتا ہے۔ اسکی اس وقت تک تھوڑی بہت کامیابی کی ذمہ دار جن کی صحت پر تجربے نے مُہر لگادی میرے نزدیک دو باتیں ہیں۔

ایک اِس مشن کا کسی خاص فرقے سے تعلق نہ رکھنا۔ اور تعلیم و تبلیغ اِسلام میں فرقی خصائص کی طرف توجہ نہ کرنا۔ دوسری بات جو اسکی کامیابی کا موجب ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسکے کارکنوں نے مُسلم لٹریچر کی نشر و اشاعت کو تقریری یا خطابی تبلیغ پر مقدم رکھا۔ زبانی تبلیغ کو بھی نہیں چھوڑا۔ مگر تصنیف و تالیف اور اُسکی اشاعت کا دائرہ بڑھایا گیا۔ اور آج ہم اِس نتیجے پر آچکے ہیں کہ اگر دو کنگ میں دو تین مبلغ وعظ و لیکچر کے لیئے مخصوص کرکے باقی کُل کا کُل عملہ مذہبی ادبیات کے پیدا کرنے اور اُس کے نشر و اشاعت میں مصروف ہو جائے تو تھوڑے ہی دنوں میں محیر العقول نتائج پیدا ہو سکتے ہیں + ۱۹۲۵ء تک کے تیرہ سالہ تجربے نے مجھے ایک مُثبتہ صداقت کی طرح اِس حقیقت پر قائم کر دیا۔ چنانچہ میں نے ایک مسلم لٹریری ٹرسٹ قائم کیا۔ اور اِس ٹرسٹ میں اِنہی دو باتوں کا لحاظ رکھا۔ ایک طرف تو اس ٹرسٹ کے ٹرسٹی مقرر کرنے میں فرقی خصوصیت کو الگ کر دیا گیا۔ دوسری طرف اِسکا مقصد اسلامی ادبیات کی نشر و اشاعت رکھا۔ اِس ٹرسٹ کے ممبر[ل] حسب ذیل رکھے گئے :-

(۱) رائٹ آنریبل لارڈ ہیڈلے الفاروق (چیئرمین)

[ل] ٹرسٹ نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ سرو سٹ ٹرسٹ کے ایک ممبر نے سر میاں محمد شفیع صاحب کو میاں صاحب سے استصواب کے بعد ٹرسٹ کے سامنے بغرض منظوری بطور ٹرسٹی پیش کیا ہے۔ ایسا ہی دو اور صاحب بھی زیر تجویز ہیں ۱۲

(۲) سر عباس علی بیگ سابق ممبر انڈیا کونسل۔

(۳) خواجہ کمال الدین۔

(۴) ووکنگ مشن کا انچارج بحیثیت عہدہ

(۵) خواجہ نذیر احمد۔ (سکریٹری)

۱۹۲۵ء سے آجتک اس ٹرسٹ نے پانچ کتابیں شائع کیں جن کے نام ذیل میں درج ہیں:—

(آ) آئیڈیل پرافٹ (مصنفہ خواجہ کمال الدین)

(۲) مجانست فی الاسلام و تعلیم مسیح علیہ السلام (مصنفہ لارڈ ہیڈلے)

(۳) اسلام کیا ہے؟ (مصنفہ مسٹر حبیب اللہ لوگرو)

(۴) کھلی چٹھی۔ بنام لارڈ بشپ لندن و سالسبری (مصنفہ خواجہ کمال الدین)

(۵) مسیح کا اصلی مذہب (مصنفہ خواجہ کمال الدین)

اِن پانچ کتابوں نے جو اِس تھوڑے سے عرصہ میں امید سے بڑھکر نتائج مرتب کیے وہ دوسری قسم کی تبلیغی کوششوں کے مقابل زیادہ مفید ثابت ہوئے۔ یہی کتابیں صدہا روحوں کو اس عرصہ میں صداقت کی طرف لے آئیں۔ اِس وقت جو کتاب زیر تصنیف ہے۔ اور جسکی تکمیل کو میری اس دو سالہ بیماری نے روک رکھا ہے۔ وہ ایک قسم کا مقدمۃ القرآن ہے۔ جس کی اشاعت پر اِنْ شاءَ اللہ مغربی دنیا میں اسلام کی طرف ایک خاص رجحان پیدا ہوگا۔

لیکن میری اِس لمبی بیماری نے مجھے ایک اور بھی سبق دیا۔ آج مشن کو

قائم ہوئے سولہ سال ہو چکے۔ خدا کے فضل نے اُس دن سے آجتک
مشن کو مالی مشکلات میں نہیں ڈالا۔ کچھ تو میری تصنیف آئے دن مشن
کو مالا مال کرتی رہی۔ دوسری طرف میں ہر دوسرے تیسرے سال مسلم
بھائیوں کو مشن کی معاونت کے لیئے خود اُن کے دروازوں پر جاکر تحریک
کرتا تھا اور میں جس قدر شکریہ اپنی قوم کا ادا کروں تھوڑا ہی کہ میری کوئی
بھی اپیل کہیں بھی رائگاں نہ ہوئی۔ آج جو اِس بیماری کے باعث میں پورے
دو سال صاحب فراش رہا۔ اور اب بھی گو امراض خبیثہ سے نجات پا چکا
ہوں۔ لیکن اسقدر اپنے میں طاقت نہیں پاتا کہ بہت جلد دورہ شروع
کر سکوں۔ اِسنے میری آنکھ ایک خاص امر کے متعلق کھول دی۔ آج
سولہ سال کے بعد مشن مالی مشکلات میں ہے۔ اور اسکا باعث بظاہر
میری بیماری ہے۔ میری بیماری میں گو مشن تو کامیابی کے ساتھ چلتا
رہا۔ لیکن نہ کوئی تصنیف نکل سکی اور نہ کسی نے مالی استحکام کے لیئے
وہ کام کیا جو جل پھر کر میں کیا کرتا تھا۔ جس سے موجودہ مالی دقتیں پیدا
ہو گئیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ میں ہمیشہ کے لیئے بقید حیات نہیں رہ سکتا
اور نہ اِس قسم کا مشن کسی ایک ذات یا کسی ایک کے قلم سے وابستہ ہو کر
مداومت کا مُنہ دیکھ سکتا ہے۔ اِس لیئے ضروری ہے کہ اب جو
اللہ تعالیٰ نے مجھے مہلک امراض سے نجات دی تو میں اپنی بقیہ
زندگی کے دن کچھ تو مذہبی تصنیف میں خرچ کروں۔ اور زیادہ تر کسی مستقل
فنڈ کے پیدا کرنے کیطرف متوجہ ہو جاؤں کہ جسکے منافع اور مفاد سے مغرب

میں اشاعت اسلام کا مسئلہ گو محدود پیمانے پر ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ کے لیئے حل ہو جائے۔ اِس لیئے میں اِس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ اگر اُنکے نزدیک مُسلم مشن ووکنگ کی گزشتہ خدمات ماجور ہو چکی ہیں تو وہ اسکے استحکام کا فکر کریں۔ اگر ہم تین چار لاکھ روپیہ بھی ایک مستقل فنڈ کی شکل میں الگ کر دیں تو اسکا منافع ہی مغرب میں اشاعت اسلام کی مالی ضروریات کا کفیل ہو سکتا ہے۔

آغاز مشن سے مَیں نے اپنی ذات کو علی العموم مشن کی آمدنیوں سے الگ رکھا۔ اور اسکے خرچ کو بھی دوسروں کے ہاتھوں میں رکھا۔ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ معاملات قومی ہیں۔ اسکے وارث صلبی وارث نہیں ہوتے۔ اسکے وارث وہی ہوتے ہیں جو اسکے اہل ہوں۔ اسی اُصول پر میں ایمان رکھتا ہوں اور آجتک اِسی پر کاربند رہا ہوں۔

میں چاہتا ہوں کہ سب سے پہلے مَیں اشاعت ادبیات اسلامی کا کوئی مستقل انتظام کر جاؤں۔ اِسی امر سے رسالہ اسلامک ریویو بھی وابستہ ہے۔ اگر کوئی کتاب اشاعت اسلام میں ایک مستقل رنگ اپنے اندر رکھتی ہے تو ریویو کی اشاعت بھی میعادی شکل میں ازبس ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارا ریویو بھی ایک مستقل اشاعت کی شکل اختیار کرے۔ اور ریویو اور دیگر اسلامی ادبیات کا جو منافع ہو۔ وہ مشن کے ذریعے اشاعت اسلام پر خرچ ہو۔ جیساکہ آجتک میری

تصانیف کا منافع جس میں ریویو بھی شامل ہے۔ مشن کے مالی استحکام پر ہی خرچ ہوتا رہا ہے۔ یہ امر مسلم لٹریری ٹرسٹ کے ٹرسٹیوں نے بھی قبول کر لیا ہے ؛

الغرض ایک مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے جسکا قیام کسی ذات واحد سے وابستہ نہ ہو۔ میں صرف اسی قدر چاہتا ہوں کہ وہ سرمایہ میری زندگی میں قائم ہو جائے۔ اور میں اپنی زندگی میں ہی اسے، اور ایسا ہی دوسرے امور کو اور ہاتھوں میں دے کر یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ مسلم لٹریری ٹرسٹ کا سرمایہ اس وقت ہنتیس ۳۶ ہزار سے اوپر ہے جو قریباً کل کا کل ٹرسٹ کی طرف سے بنکوں میں بصورت فکسڈ ڈیپازٹ رکھا گیا ہے۔ اور اسکے منافع سے ہی آجتک ٹرسٹ نے اپنے اخراجات نکالے ہیں۔ یہ فنڈ بھی دراصل ووکنگ مشن کی ہی اغراض کے پورا کرنے کے لیئے قائم ہوا ہے ؛

جو اصحاب میری اس عرضداشت کو پڑھیں وہ اس کام میں میری معاونت کریں۔ ایک ایک روپے سے لاکھوں روپے جمع ہو سکتے ہیں۔ اگر مسلم بھائی میری اس اپیل پر توجہ کریں۔ اور میری اس بیماری کو بنظر عبرت دیکھیں اور یہ یقین کریں کہ میری زندگی کے دن تھوڑے ہیں۔ اور اس وقت مجھ میں وہ طاقت وقوت بھی نہیں جو اس بیماری سے پہلے تھی۔ خدا چاہے تو وہ اب بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیئے جس کام کا میں نے ارادہ کیا ہے اسمیں وہ میرے

معاون ہوں ۔

یہ تو ناممکن ہے کہ میں ہر جگہ پہنچ سکوں ۔ یا اصالتاً ہر ایک دوست کو مل سکوں ۔ جو میری اس اپیل کو پڑھے ۔ وہ اس طرف توجہ فرمائیں ۔ یہ زکوٰۃ کے بھی ایام ہیں ۔ اور اس سے بہتر زکوٰۃ کا مصرف مجھے کوئی اور نظر نہیں آتا ۔ زکوٰۃ کے علاوہ اگر مسلم بھائی تھوڑی تھوڑی مدد بھی کریں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے ۔ مسلم لٹریری ٹرسٹ کے موجودہ سرمایہ کے علاوہ خود مشن کے ریزرو فنڈ میں چار ہزار سے اوپر روپیہ موجود ہے ۔ فی الجملہ تبلیغی اغراض کے لئے چالیس ہزار سے اوپر روپیہ تو موجود ہے لیکن یہ ایک بے حقیقت رقم ہے ۔ میری استدعا یہ ہے کہ بغرض اشاعت اسلام سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس وقت تین قسم کی امداد فرمائیں ایک تو مشن کو موجودہ مالی مشکلات سے نکالنے کا فکر کریں ۔ دوسرے رسالہ اسلامک ریویو اور اسلامی ادبیات کی نشر و اشاعت کے لئے کسی مستقل فنڈ کے پیدا کرنے کی طرف توجہ فرمائیں ۔ اگر ہم ایسے فنڈوں کے قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو یہ قومی سرمایہ ہمیں ہمیشہ کی دقتوں سے آزاد کر دیگا ۔ زر امداد کی ترسیل کے وقت جو میرے نام پر یا حسب معمول ہو یہ کھولکر لکھدیا جائے کہ انکی زر امداد کس مد میں جانی چاہیئے ۔ اگر ان کی تحریر میں اس قسم کی تفصیل نہ ہوگی تو ان کے عطیات کو بحصہ رسدی تقسیم کر دیا جائے گا ۔ والسلام

خواجہ کمال الدین

بماہ دسمبر ۱۹۲۳ء از کشمیر

لٹریچر میں یہ کتاب اس موضوع کی پہلی ہے۔ اسمیں ثابت کیا ہے کہ عربی سے سب زبانیں نکلی ہیں۔ اور کل ممالک کے آباد اجداد عربی تھے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قیمت بلا جلد ۱۲ر مجلد عہ ر علاوہ محصول وغیرہ

پیامِ اسلام

قرآن کریم سے ایک اجنبی دل کو معرف کرنے والی۔ کلام پاک سے اجنبیت غیریت اور تنفر کو دور کرکے اس سے فیضیاب کرنے والی معرکۃ الآرا ضخیم کتاب ہے

"آسمانی بادشاہت اور اسکا چارٹر"

اس وقت خواجہ صاحب کے زیر تصنیف ہے۔ اسکا مختصر سا خاکہ دیکھنا ہو تو "پیام اسلام" پڑھ لو۔ اس کتاب میں قرآن کی ضرورت اور اُسکے اسالیب خاصہ پر بحث ہوگی۔ قرآن کریم کے مضامین کی جداگانہ عنوانوں کے تحت میں تقسیم ہوگی۔ خاصکر امور ذیل پر بحث ہوگی۔ انسان کے متعلق قرآن کا نصب العین کائنات میں انسان کا مقام۔ خلافت الٰہیہ اور اُسکے حصول کے ذرائع۔ روحانی۔ اخلاقی۔ تمدنی۔ اقتصادی۔ سیاسی تعلیمات قرآنی۔ تزکیہ و اصلاح نفس۔ ایک حیوان بشکل انسان کا ربانی اخلاق سے متخلق ہونا۔ انسانی کمالات اور اُسکے نقص۔ موجودہ زمانہ کی مشکلات اور اخلاقی بد عنوانیاں اور ان کا قرآنی حل و دفعیہ۔ بعض صداقتہائے ملیہ وغیرہ وغیرہ پر نہایت زبردست بحثیں۔ فہم قرآن اور اُس سے مستفید ہونا آسان ہو جائے گا۔

ووکنگ مسلم لٹریری فنڈ

ایک ٹرسٹ ہے۔ جو ووکنگ میں قائم ہوا ہے جس کے پریزیڈنٹ عالیجناب لارڈ ہیڈلے فاروق بالقاب (نو مسلم) اور دیگر ٹرسٹیز جناب سر عباس علی بیگ صاحب سابق ممبر انڈیا کونسل حضرت خواجہ کمال الدین صاحب امام شاہجہان مسجد ووکنگ (انگلستان) اور کے۔ این۔ احمد بیرسٹر ہیں۔ اس ٹرسٹ کی غرض وغایت انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر پیدا کرنا۔ اس کی طباعت اور پھر اس کی وسیع پیمانے پر مفت وقیمتاً نشر واشاعت کرنا ہے۔ اور جہاں جہاں لیکچر یا تقریروں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ ان گوشوں تک اسلام کی دعوت کو لٹریچر کے ذریعہ پہنچانا ہے۔ اس وقت یہ ٹرسٹ نصف درجن سے زیادہ انگریزی کتب شائع کر چکا ہے۔ جو از حد مقبول ہوئی ہیں۔ اس ٹرسٹ کی نسبتی خیز مطبوعات نے بہت ہی قلیل عرصہ میں یورپین توجہ کو جذب کر لیا ہے۔ اس ٹرسٹ کی کتب خریدنی اور اس کی امداد ہر مسلم کا فرض اولین ہے۔

خط وکتابت وترسیل زر بنام مینیجر رسالہ اشاعت اسلام عزیز منزل برانڈرتھ روڈ لاہور پہنچنی چاہیے

فہرست کتب مسلم بک سوسائٹی مصنفہ خواجہ کمال الدین صاحب عزیز منزل برانڈرتھ روڈ لاہور

نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت	نام کتاب	قیمت
توحید فی الاسلام ۔۔	عہ/	لمعات انوار محمدیہ ۔۔	۴/	پیام اسلام	۸/
راز حیات یا انجیل عمل ۔	۵/	مذہب محبت ۔۔۔ ۔۔	۵/	پادری صاحبان کیلئے حل طلب	۱۰/
سلک مروارید ۔۔ ۔۔	عہ/	ذرات عالم کا مذہب	۵/	اسلامی نماز اور اس پر مغربی اعتراضات	۱/
خطبات عزیزیہ ۔۔ ۔۔	۱۲/	اسوۂ حسنہ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۶/	اسلامی نماز اور اس کا فلسفہ	۳/
مقصد مذہب ۔۔ ۔۔	۳/	ام الالسنہ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۱۲/	صدائے نصرت بہ اہل کنائس	۳/
ضرورت الہام ۔۔ ۔۔	۱۲/	براہین نیرہ ۔۔ ۔۔ ۔۔	۱۲/	دنیا کے مشہور شہدائے ثلاثہ	۷/
ینابیع المسیحیت ۔۔ ۔۔	۴/	اسلام اور علوم جدیدہ	۴/	تفسیر سورۂ فاتحہ ۔۔ ۔۔	۳/
مطالعۂ اسلام ۔۔ ۔۔	۹/	یسوع کی الوہیت ۔۔	۴/	سیرۃ نبوی ۔۔ ۔۔ ۔۔	۳/
مکالمات ملیہ ۔۔ ۔۔	۱۰/	روحانیات فی الاسلام	۱۲/	تعداد مسلمان یورپ فی درمن ۔۔ ۔۔	۱۰/
اسلام میں کوئی فرقہ نہیں	۱۲/	ہستی باری تعالیٰ ۔۔ ۔۔	۶/		

تمام فرمائشیں بنام مینیجر مسلم بک سوسائٹی عزیز منزل برانڈرتھ روڈ لاہور پنجاب بھیجنی چاہیے